الیکساندر گرین

ارغوانی بادبان



الیکساندر گرین

ارغوانی بادبان

الیکساندر گرین کی زندگی

سانپ

والد کا عتاب

بندرگاہ کا کمانڈنٹ

«رادوگا» اشاعت گھر تاشقند
۱۹۸۴ء

ترجمہ: منظر سلیم
ڈیزائن: ک۔ ایشین

АЛЕКСАНДР ГРИН

АЛЫЕ ПАРУСА

Повесть и рассказы

На языке урду

ALEXANDER GRIN

CRIMSON SAILS

Short novel and stories

in Urdu

Г $\frac{4803010102—285}{031\ (01)—84}$ 379—84

سوویت یونین میں شائع شدہ

ترتیب

الیکساندر گرین کی زندگی

۱

الیکساندر استیپانووچ گرینیفسکی کا جو الیکساندر گرین کے قلمی نام سے لکھتے تھے، اخروٹ کے صدیوں پرانے درختوں کی بنا پر قابل ذکر قصبے استاری کریمیا میں جولائی ۱۹۳۲ء میں انتقال ہوا تھا۔

ان کی زندگی بڑی دشوار تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے زمانے نے انہیں مجرم یا جھنجلایا ہوا غیر مہذب شخص بنا دینے کی سازش کر رکھی ہو۔ لیکن ناقابل یقین حد تک نامساعد حالات میں بھی اس مغموم و ملول آدمی نے اذیتوں سے بھری ہوئی اپنی ساری زندگی میں اپنے بلند پرواز تخیل، جذبات کی پاکیزگی اور شرمیلی مسکراہٹ کو بےداغ حالت میں برقرار رکھا۔

گرین کی زندگی انقلاب سے قبل کے انسانی رشتوں کے نظام کی دی ہوئی بڑی بےرحمانہ سزا تھی۔ پرانا روس گرین سے بہت سنگدلی کے ساتھ پیش آیا تھا، اس نے انہیں بچپن ہی میں حقیقت سے محبت کرنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ ان کے حالات بےحد خراب تھے، زندگی اس لائق نہیں معلوم ہوتی تھی کہ بسر کی جائے، اس کی مثال تو قانون کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کو من مانی سزائے موت دینے والے کسی وحشی گروہ کی سی تھی۔ گرین بچ تو نکلے لیکن حقیقت پر ان کا عدم اعتماد عمر بھر کے لئے مستقل شکل اختیار کر گیا۔ وہ ہمیشہ اس یقین کے ساتھ فرار کی راہیں تلاش کرتے رہے کہ روزمرہ زندگی کی "لغویات اور کوڑے کرکٹ" کی بہ نسبت چکرا دینے والے خوابوں کے سہارے جینا کہیں بہتر ہے۔

گرین ادیب بن گئے، اپنی کتابوں میں زندہدل اور جیالے افراد کی دنیا کی، مہکتے جنگلوں اور چمکتی ہوئی دھوپ کی خوبصورت دھرتی کی، اس دھرتی کی جو نقشوں میں نہیں دکھائی جاتی، تخلیق کرنے اور تیز شراب کی طرح سر کو چکرا دینے والے واقعات بیان کرنے لگے۔

"میں نے ہمیشہ اور ہر جگہ یہی ایک بات محسوس کی تھی: کہانیوں سے خواہ وہ کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں محض اس لئے لطف اندوز ہوا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو گھنٹے بھر کے لئے اپنی وبال جان روزمرہ زندگی کو بھول جانے کا موقع فراہم کرتی ہیں" میکسم گورکی نے اپنی کتاب "منزل کی تلاش" میں لکھا تھا۔

گرین کے معاملے میں یہ بات پوری طرح سچ ہے۔
ان کے لئے روسی زندگی پس‌مانده قصبے ویاتکا، پیشه‌ورانه تربیت کے ایک گندے اسکول، گھٹیا اقامت گاهوں، هلکان کر دینے والی محنت، قیدخانے اور مستقل بھوک تک ھی محدود تھی۔ تاهم افق کی بھوری حد سے آگے بڑھ کے کہیں پر روشنیوں، سمندری هواؤں اور پھولتی هوئی گھاسوں کی سرزمینیں جگمگا رهی تھیں۔ وهاں رهتے تھے دھوپ سے سنولائے هوئے جسموں والے افراد: سونے کے متلاشی، سمور کے لئے پھندے سے جانوروں کا شکار کرنے‌والے، پرجوش آواره گرد، بچوں جیسی خوش و خرم اور نیک‌دل عورتیں اور خاص طور سے سمندر نورد۔
گرین اس یقین کے سهارے جیتے رهے که دور دراز سمندروں میں جزیروں پر ایسی سرزمینیں پھول کھلاتی اور گنگناتی رهتی هیں۔

انقلاب آیا۔ یه آغاز تھا گرین کو ظلم و جبر کا نشانه بنانے والی بهت سی باتوں کے خاتمے کا، فرسوده انسانی رشتوں کے بهیمانه نظام، استحصال اور حقوق سے محرومی کے خاتمے کا، هر اس شے کے خاتمے کا جس نے انهیں زندگی سے فرار کر کے خوابوں اور کتابوں کی دنیا میں پناه لینے پر مجبور کر دیا تھا۔
آمد انقلاب سے گرین کو صحیح معنوں میں بےحد مسرت حاصل هوئی لیکن انقلاب نے ایک نئے مستقبل کے جن خوبصورت امکانات کا دروازه کھول دیا تھا وه ابھی صرف دھندلے دھندلے هی نظر آ رهے تھے اور گرین ان لوگوں میں سے تھے جو مستقل بےصبری کے مرض میں مبتلا رهتے هیں۔
دراصل انقلاب جشنی لباس سے آراسته هو کے نهیں آیا تھا۔ انقلاب تو لڑائی سے لوٹے هوئے سورما کی طرح خون کے دھبوں کے ساتھ آیا تھا یا پھر کسی سرجن کی طرح۔ اس نے انحطاط کی صدیوں پرانی تهوں کو الٹ پلٹ دیا۔
گرین کو شاندار مستقبل بهت دور معلوم هو رها تھا اور وه اس سے فوری طور پر هم‌کنار هونا چاهتے تھے۔ وه شهروں کی پاک صاف هوا میں سانس لینا اور درختوں کی سرسراهٹوں اور بچوں کے قهقهوں سے مسرور هونا چاهتے تھے، لوگوں کے گھروں میں داخل هونا، ان کے ساتھ نامعلوم علاقوں کی کھوج سے متعلق جوشیلی مهموں میں شرکت کرنا اور ان کی بامعنی اور مسرور زندگی میں حصه لینا چاهتے تھے۔
لیکن حقیقت گرین کو فوری طور پر یه سب کچھ نه دے سکی۔ صرف تخیل هی انهیں غیرمعمولی واقعات اور افراد کی اس دنیا تک پهنچا سکتا تھا جس کے وه خواب دیکھا کرتے تھے۔
وه بچپن هی میں نهایت هی درست تخیل کے مالک تھے اور جب ادیب بن گئے تو بےوجود ملکوں کو جهاں ان کے مختصر افسانوں کے واقعات پیش آتے تھے، پراسرار

مناظر قدرت کی طرح نہیں بلکہ ایسی جگہوں کی طرح دیکھنے لگے جن کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا اور جہاں سینکڑوں بار جا چکے تھے۔

وہ ان جگہوں کے تفصیلی نقشے کھینچ سکتے تھے، نباتات کی اقسام، سڑک اور دریا کا ایک ایک موڑ اور مکانات کی ترتیب دکھا سکتے تھے اور خاص بات یہ ہے کہ بےوجود بندرگاہوں کے سارے جہازوں کو تمام بحری تفصیلات اور ان کے بےفکر اور زندہ دل عملے کی تمام خصوصیات کے ساتھ شمار کر سکتے تھے۔

ان بےوجود مناظر میں سے ایک کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے۔ گرین اپنے مختصر افسانے "لینفیر نو آبادی" میں لکھتے ہیں:

"شمال میں کھریا کی ڈھلواں چٹانوں کے پیچھے جن پر کہیں کہیں درازیں اور پژمردہ جھاڑیوں کے قطعات نمایاں تھے، کسی سبز گلے کی طرح تاریک اور بےحس و حرکت جنگل افق تک پھیلا ہوا تھا۔

مشرق میں جھیل کے پار قصبے سے باہر جانےوالی پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک سفید ربن جیسی نظر آ رہی تھی۔ اس کے کناروں پر کہیں کہیں موجود درخت اتنے چھوٹے چھوٹے لگ رہے تھے جیسے کاہو کی کونپلیں ہوں۔

مغرب میں پہاڑیوں اور تنگ گھاٹیوں والے وسیع علاقے کو گھیرے ہوئے سمندر کی گہری نیلی، آئینے جیسی چمکتی ہوئی سطح پھیلی ہوئی تھی۔

اور جنوب میں ایک نشیب کے مرکز سے جس کے پہلوؤں پر کہیں کہیں بےترتیبی سے لگے ہوئے درختوں سے گھرے رنگ برنگے مکانات اور فارم واقع تھے، لینفیر نو آبادی کے ڈھلواں مستطیل‌نما باغات اور جتے ہوئے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔"

گرین کا انتقال ہوا تو وہ اس بات کا فیصلہ ہمارے اوپر چھوڑ گئے کہ ہمارے عہد کو پرجوش خواب بینوں کی ضرورت ہے کہ نہیں۔

ہاں، ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ لفظ "خواب‌بین" کو مذاق سمجھنے کا سلسلہ ترک کر دیا جائے۔ بہت سے افراد اب بھی خواب دیکھنے کا سلیقہ نہیں رکھتے اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ نہیں چل پاتے۔ تاہم خوابوں کا دامن حقیقت سے خالی نہ ہونا چاہئے۔ خوابوں کو مستقبل کی پیش‌گوئی کرنی چاہئے، ہمیں محسوس کرانا چاہئے کہ ہم اس مستقبل میں زندگی گزارنے لگے ہیں اور خود بھی بدلتے جا رہے ہیں۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ گرین کے خواب زندگی سے کوئی رشتہ نہیں رکھتے تھے اور ان کی حیثیت محض تخیل کی الٹی سیدھی، بےمعنی پرواز کی سی تھی۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ گرین مہم جوئی کے افسانوں کے خالق تھے، ان کے پلاٹ تو بڑے شاندار ہوتے تھے لیکن کتابیں معاشرتی اہمیت سے یکسر خالی۔

کسی ادیب کی اهمیت کا تعین اس بات سے کیا جاتا هے که وه همیں کس انداز سے متاثر کرتا هے، اس کی کتابیں همارے اندر کس نوعیت کے جذبات، خیالات اور طرز عمل بیدار کرتی هیں اور وه هماری معلومات میں اضافه کرتی هیں یا انهیں صرف لفظوں کے دلچسپ تسلسل کی حیثیت سے پڑھا جاتا هے۔

گرین نے اپنی کتابوں کی دنیا میں آن بان رکھنےوالے، بےغرض، نیک‌دل اور بچوں جیسے ساده و معصوم افراد کی ایک پوری نسل آباد کر دی هے۔

یه دلکش اور صحت‌مند افراد گرین کے قدرتی مناظر کی تازی اور مهکتی هوئی هواؤں میں سانس لیتے هیں اور یه مناظر قطعاً حقیقی هیں اور اپنی ناقابل مزاحمت خوبصورتی سے دل کو چھو لیتے هیں۔ گرین کے کردار جس دنیا میں رهتے هیں وه صرف انهی افراد کو غیرحقیقی معلوم هو سکتی هے جو مزاجاً بےحس هیں۔ جس شخص کو ساحل پر نمکین گرم هوا میں پهلی بار گهری سانس لینے پر سر کے دهیرے سے چکرا جانے کا تجربه هو چکا هے اسے گرین کے پیش کئے هوئے مناظر کے حقیقی هونے کا فوراً هی احساس هو جائےگا۔

گرین کے افسانے دلوں میں خطرے، مهم‌جوئی اور اس "شعور خوب‌تر" سے بھری هوئی پرجوش زندگی کی تمنائیں بیدار کرتے هیں جو انجانے علاقوں کے متلاشیوں، سمندر نوردوں اور مسافروں کی خاصیت هے۔ ان افسانوں کے مطالعے کے بعد قارئین ساری دنیا کو، ادیب کے تخیل کے ملکوں کو نهیں بلکه نور سے معمور حقیقی ملکوں کو ان کے جنگلات، ان کے بندرگاهوں کے بھانت بھانت کی بولیوں کے شور غل اور وهاں کے باشندوں کے جذبات اور محبتوں سمیت دیکھنے کو بےتاب هو اٹھتے هیں۔

"دنیا اپنی ناقابل رسائی وسعتوں کو دیکھنے کی ترغیب دے دے کر مجھے تڑپاتی رهتی هے" گرین نے لکھا تھا۔ "اس کے سمندر بےکراں هیں، جزائر بےشمار اور اس میں جانے کتنے هی پراسرار، دلوں پر جادو کرنے والے گوشے اور شگاف هیں۔"

اساطیر کی ضرورت بڑوں کو بھی هے اور بچوں کو بھی کیونکه ان کے مطالعے سے پیدا هونےوالا جوش و خروش انسانی همدردی کے اعلا و ارفع جذبات کا سرچشمه هے۔ یه خیالی قصے همیں اپنے آپ سے مطمئن نهیں هونے دیتے، نئے نئے تابنده آفاق کو هماری نظروں کے سامنے لاتے هیں، همیں ایک دوسری طرح کی زندگی کی جھلک دکھا کر بےچین کر دیتے هیں اور هم اس زندگی سے هم‌کنار هونے کی شدید آرزو سے تڑپنے لگتے هیں۔ یهی ان کی خوبی هے اور یهی خوبی هے گرین کے مختصر افسانوں کی زوردار کشش کی بھی حالانکه اسے الفاظ میں همیشه نهیں بیان کیا جا سکتا۔

گرین کے پلاٹوں میں مهم‌جوئی کے عنصر کی طرف توجه مبذول کی گئی هے۔ یه عنصر یقیناً موجود هے لیکن اس کی حیثیت مواد کی وسعت اور گهرائی کے محض اوپری خول کی سی هے۔ گرین کی کتابوں میں بنی نوع انسان سے محبت بس اسی کو نه نظر آئےگی جو بےبصیرت هو۔

گرین شاندار عکاس فطرت اور قصہ‌گو ہونے کے ساتھ ہی ساتھ نفسیاتی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے انتہائی معمولی افراد کے ایثار، جسارت اور شجاعت کے متعلق لکھا ہے۔ انہوں نے کام اور اپنے پیشے سے محبت کے بارے میں اور قدرت کی لامحدود قوتوں اور اس کے ناقابل ادراک ہونے کے بارے میں لکھا ہے۔ اور عورتوں کے متعلق تو انہوں نے جس پاکیزہ، نفیس اور جذباتی انداز سے لکھا ہے اس سے صرف چند ہی ادیب لکھ سکے ہیں۔

میں گرین کی کتابوں سے سینکڑوں اقتباسات پیش کر سکتا تھا جو ہر اس شخص کو متاثر کر سکتے ہیں جس نے حسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت کھو نہیں دی لیکن قارئین انہیں خود ہی تلاش کر لیں گے۔

گرین نے کہا تھا: "ساری دھرتی اور اس پر جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب ہمیں زندگی کے لئے اور اس زندگی کا جہاں بھی وجود ہے وہاں اسے تسلیم کرنے کے لئے عطا کیا گیا ہے۔"

گرین ایسے ادیب ہیں جن کی ہمارے عہد کو ضرورت ہے کیونکہ وہ ان اعلا احساسات کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں جن کے بغیر کسی سوشلسٹ معاشرے کی تکمیل کبھی بھی نہیں ہو سکتی۔

ک۔ پاؤستوفسکی

ارغوانی بادبان

(فنطاسیہ)

انتساب

نینا نکولائیونا گرین کے نام

۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء

پیتروگراد

۱

پیشین گوئی

لونگرین تین سو ٹن کے دو مستولی مضبوط جہاز "اوریان" کا ایک ملاح تھا۔ اسے کام کرتے دس برس بیت چکے تھے اور جہاز سے اس کا لگاؤ اس سے بھی زیادہ گہرا ہو چکا تھا جتنا کہ کچھ بیٹوں کا اپنی ماؤں سے ہوتا ہے۔ لیکن آخرکار وہ سمندر کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گیا۔

یہ واقعہ کچھ یوں پیش آیا تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق کافی دنوں کے بعد ایک بار گھر لوٹا تو ہمیشہ کے برعکس اسے دور ہی سے اس کی بیوی میری دھلیز پرکھڑی نہ نظر آئی جو لونگرین کو دیکھتے ہی بےتابی سے ہاتھ ہلاتی اور پھر بےتحاشا تیزی سے اس کی طرف دوڑ پڑتی تھی۔ میری کے بجائے اسے پریشان پریشان سی ایک پڑوسی عورت پالنے کے قریب جس کا لونگرین کے چھوٹے سے گھر میں اضافہ ہو گیا تھا، کھڑی ہوئی نظر آئی۔

"بھئی پڑوسی، میں تین مہینوں سے اسے پال رہی ہوں" عورت نے کہا۔ "یہ رہی تمہاری بیٹی۔"

لونگرین کے دل پر بجلی سی گر پڑی اور اس نے پالنے پر جھک کر آٹھ مہینوں کی اس ننھی سی جان کو دیکھا جس کی نظریں اس کی طویل داڑھی پر جم کر رہ گئیں۔ پھر وہ بیٹھ کر فرش کو تکنے اور اپنی مونچھوں کو پھڑکانے لگا جو یوں تر ہو گئی تھیں جیسے بارش میں بھیگ گئی ہوں۔

"میری کب چل بسی؟" اس نے پوچھا۔

پڑوسن نے دکھ بھری کہانی چھیڑی۔ بیچ بیچ میں وہ بچی کو پیار سے چمکارتی اور لونگرین کو یقین دلاتی جا رہی تھی کہ میری اب جنت میں پہنچ چکی ہے۔ تفصیلات جاننے کے بعد لونگرین کو جنت لکڑی کے سائبان سے کچھ زیادہ منور نہ معلوم ہوئی اور اس نے سوچا کہ اس لمحے وہ تینوں ساتھ ساتھ ہوتے تو دوسری دنیا کو کوچ کر جانےوالی عورت کے لئے معمولی لیمپ کی روشنی بھی بےنظیر مسرت ثابت ہوتی۔

نوجوان ماں کی ساری پونجی کوئی تین ماہ قبل اچانک ہی ختم ہو گئی تھی۔ لونگرین اس کے لئے جو کچھ چھوڑ گیا تھا اس کا کم از کم نصف حصہ تو دشوار زچگی کے سلسلے میں ڈاکٹروں پر اور نو زائیدہ بچی کی ضروریات پوری کرنے ہی

میں صرف ھو گیا تھا۔ آخر میں بچے کھچے تھوڑے سے پیسے جو بہت اھمیت رکھتے تھے، کھو گئے تو میری کو مجبوراً قرض کے لئے مینرس کے آگے ھاتھ پھیلانا پڑا۔ شراب خانے اور دوکان کا مالک یہ مینرس خاصا امیر تصور کیا جاتا تھا۔

میری شام کو چھ بجے مینرس کے پاس گئی اور سات بجے کے قریب وہ لیس جانےوالی سڑک پر پڑوسی عورت کو اس حالت میں ملی کہ چہرے سے بدحواسی ٹپک رھی تھی اور آنکھوں سے آنسو۔ کہنے لگی کہ شادی کی انگوٹھی گروی رکھنے کے لئے شہر جا رھی ھے۔ پھر اس نے پڑوسن کو بتایا کہ مینرس کچھ رقم قرض دینے پر راضی تو ھو گیا تھا لیکن اس کے جسم کو اپنی ھوس کا نشانہ بنانے کی شرط کے ساتھ۔ میری اسے ٹھکرا کے چلی آئی تھی۔

"گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا تک نہیں" اس نے پڑوسن سے کہا تھا۔ "میں شہر جا رھی ھوں۔ وھاں جو کچھ ھاتھ لگےگا اس سے شوھر کی واپسی تک جوں توں کام چل ھی جائےگا۔"

شام سرد تھی۔ ھوائیں بھی چل رھی تھیں۔ پڑوسن نے نوجوان عورت کو سمجھا بجھا کر ایسے میں جبکہ رات سر پر کھڑی تھی، لیس جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "ارے میری، تم شرا بور ھو جاؤگی۔ بوندا باندی شروع ھو چکی ھے اور ھواؤں کے تیور بتا رھے ھیں کہ طوفان آنے والا ھے۔" لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ھوئی۔

اس ساحلی گاؤں سے شہر تک کا فاصلہ تیز تیز قدم اٹھانے پر بھی کم از کم تین گھنٹوں میں طے ھوتا پھر بھی میری نے اپنی پڑوسن کے مشورے پر کان نہ دھرے۔ "اب اور میں آپ کی آنکھوں میں خار نہ ثابت ھوں‌گی" اس نے کہا۔ "نوبت یہاں تک پہنچ چکی ھے کہ شاید ھی کوئی خاندان ھو جس سے میں نے روٹی، چائے یا آٹا قرض نہ لے رکھا ھو۔ انگوٹھی رھن رکھ دوں‌گی اور سارے مسئلے حل ھو جائیں‌گے۔" وہ شہر گئی، واپس لوٹی اور اگلے ھی روز سردی بخار نے اسے پلنگ سے لگا دیا۔ بارش اور شام کے شدید پالے کے باعث اسے ڈبل نمونیا ھو گیا جیسا کہ شہر سے نیک‌دل پڑوسن کے بلائے ھوئے ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ ھفتے بھر بعد ھی لونگرین کے دھرے پلنگ پر ایک جگہ خالی ھو گئی اور پڑوسن اس کی بیٹی کی دیکھ بھال کے لئے اس کے گھر میں آ کے رھنے لگی۔ بچاری بیوہ تھی اور دنیا میں بالکل تنہا اس لئے اسے ایسا کرنے میں کوئی دشواری نہ ھوئی۔ "اس کے علاوہ" عورت نے اضافہ کیا، "بچی کے سہارے میرا وقت بھی کٹ جاتا ھے۔"

لونگرین نے شہر جا کے ملازمت سے سبک‌دوشی اختیار کی، اپنے ساتھیوں سے رخصت ھوا اور ننھی اسول کی پرورش کرنے کے لئے گھر لوٹ آیا۔ بیوہ رضاعی ماں کی حیثیت سے ملاح کے گھر ھی میں مقیم رھی یہاں تک کہ اسول نے اپنے پیروں پر چلنا سیکھ لیا۔ دھلیز پار کرتے وقت پاؤں اٹھانے پر البتہ وہ گر پڑتی تھی۔ آخر وہ

گرے بغیر دھلیز بھی پار کرنے لگی اور لونگرین نے کہا کہ اب وہ خود ہی بچی کی دیکھ بھال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے عورت کی مدد اور نیک دلی کا شکریہ ادا کیا اور رنڈوے کی تنہا اور بےکیف زندگی شروع کر دی۔ اب اس کے تمام خیالوں، خوابوں، محبتوں اور یادوں کا واحد مرکز یہی ننھی بچی ہی تھی۔

سمندروں میں دس برسوں تک مارے مارے پھرنے کے نتیجے میں لونگرین نے کوئی دولت نہیں بٹوری تھی۔ آخر اس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کے بنائے ہوئے نفیس کھلونے شہر کی دوکانوں پر بکنے لگے۔ ان میں کشتیوں، لانچوں، ایک اور دو عرشے والے جہازوں، گشتی جہازوں اور دخانی کشتیوں کے چھوٹے چھوٹے ماڈل شامل ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جس سے وہ بخوبی واقف تھا اور جو کھلونوں کی نوعیت کی بنا پر بندرگاھوں کی چھل پھل اور سمندروں میں گزاری ہوئی زندگی سے محرومی کی کسی حد تک تلافی کر دیتا تھا۔ اس طرح لونگرین جو کچھ کما لیتا تھا وہ باپ بیٹی کی آرام کے ساتھ گزر بسر کے لئے کافی ہوتا تھا۔ یارباشی تو خیر اسے کبھی بھی نہیں آتی تھی لیکن اب بیوی کے انتقال کے بعد وہ بالکل گوشہ نشین ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی کسی تیوھار کے موقعے پر وہ شراب‌خانے میں دکھائی دیتا لیکن کسی کا ساتھ نہ دیتا، بار میں وادکا کا ایک گلاس حلق میں انڈیلتا اور اپنے پڑوسی کے سارے سوالوں اور علیک سلیک کے جواب میں مختصراً "جی ھاں"، "جی نہیں"، "ھیلو"، "خدا حافظ"، "بس جی رھا ھوں" کہتا ہوا باھر نکل آتا۔ ملاقات کے لئے گھر آنےوالوں کو وہ برداشت ھی نہیں کر پاتا تھا۔ انہیں وہ زبردستی تو نہیں نکال باھر کرتا تھا لیکن سخت لہجے میں ایسے اشارے اور عذر پیش کرتا تھا جن کے بعد آنےوالوں کے لئے اپنی کسی مصروفیت کا بہانہ تراش کر جلدی جلدی اس کے یہاں سے کھسک لینے کے سوا اور کوئی چارہ ھی نہیں رہ جاتا تھا۔

وہ خود کبھی کسی کے ھاں جاتا ھی نہیں تھا۔ اس طرح اس کے اور گاؤں والوں کے درمیان سردمہری اور کشیدگی کی ایک دیوار سی کھڑی ھو گئی اور اگر لونگرین کے پیشے یعنی کھلونا سازی کا کسی بھی لحاظ سے گاؤں کے حالات پر انحصار ھوتا تو اس نے اس کشیدگی کے نتائج یقیناً بری طرح محسوس کئے ھوتے۔ اسی طرح وہ اپنی روزمرہ ضروریات کی ساری چیزیں بھی شہر سے خرید لاتا تھا اور مینرس ایک ماچس تک لونگرین کے ھاتھ فروخت کرنے کی ڈینگ نہیں مار سکتا تھا۔ وہ اپنے سارے گھریلو کام بھی خود ھی انجام دیا کرتا تھا اور اس نے لڑکی کی پرورش کرنے کے دشوار فن پر بھی جو کسی مرد کے لئے بہرحال غیر معمولی ھوتا ھے، عبور حاصل کر لیا۔

اسول اب پانچ سال کی ھو چکی تھی اور اس کے باپ کی مسکراھٹ میں پہلے سے کہیں زیادہ نرمی پیدا ھو چلی تھی۔ وہ لونگرین کی گود میں بیٹھی اس کی بند بٹنوں کی واسکٹ کے اسرار پر محو حیرت ھوتی یا ملاحوں کے وحشی، تند و تیز

گیت گا رہی ہوتی اور باپ اس کے حساس، پیارے پیارے چھوٹے سے چہرے پر نظریں جمائے ہوتا تو اس کی مسکراہٹ سے خاص طور پر بڑی نرمی اور محبت جھلکنے لگتی۔ ان گیتوں کو کوئی بچہ بعض الفاظ کو تتلاہٹ کے ساتھ ادا کر کے گاتا تھا تو ایسے ریچھ کے رقص کا خیال آ جاتا تھا جس کی گردن میں زردی مائل نیلا فیتہ بندھا ہو۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے منحوس سایوں نے باپ ہی کو نہیں بیٹی کو بھی لپیٹ لیا۔

بہار کا زمانہ تھا، وقت سے پہلے آ جانے والی بہار کا جو سرما ہی کی جیسی سنگ‌دل تھی پھر بھی اس سے مختلف۔ بلا کی سرد باد شمال کے جھونکے کوئی تین ہفتوں تک ٹھٹھری ہوئی دھرتی پر سنسناتے رہے۔

ماہی‌گیری کی کشتیاں گھسیٹ کے ساحل پر لے آئی گئی تھیں اور ان کے سیاہ پیندوں کی طویل قطار سفید ریت پر کسی بہت بڑی مچھلی کی ریڑھ کی ہڈی جیسی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں بھلا کس کی ہمت تھی جو سمندر کا رخ کرتا۔ گاؤں کی واحد سڑک پر سناٹا چھایا رہتا تھا۔ ساحلی پہاڑیوں سے تیزی سے اتر کے خالی افق کی طرف جاتے ہوئے سرد ہواؤں کے بگولوں نے کھلے میدانوں کو اذیت‌گاہ میں بدل دیا تھا۔ کپرنا گاؤں کے تمام گھروں کی چمنیوں سے صبح سے شام تک دھواں نکل نکل کے ڈھلواں چھتوں پر لہراتا رہتا تھا۔

تاہم غضب‌ناک باد شمال والے دن لونگرین کو لبھا کر اس کے چھوٹے سے آرام‌دہ گھر سے اس صاف و شفاف دن کی بہ‌نسبت زیادہ باہر نکالتے تھے جبکہ آفتاب اپنی سونے کے تاروں والی چادریں سمندر اور کپرنا پر پھیلا دیا کرتا تھا۔ وہ ساحل سے سمندر کے اندر تک بنے ہوئے لمبے چوبی پل کے بالکل سرے تک پہنچ کے اطمینان سے پائپ پیتا جس کے دھوئیں کو ہوائیں اڑاتی رہتیں۔ وہ لہروں کی واپسی سے ساحل کے نزدیک برہنہ ہو جانے والی رتیلی تہہ پر اس خاکستری جھاگ کے بلبلوں کو دیکھتا رہتا جو بمشکل ہی لہروں کا ساتھ دے پاتا تھا۔ لہروں کا سیاہ، طوفانی افق کی جانب گرجدار سفر درمیانی جگہ کو وحشیانہ تندی کے ساتھ دوری پر واقع اپنی جائے سکون کی طرف سرپٹ دوڑتی ہوئی طویل ایالوں والی پراسرار مخلوقات کے جھنڈوں سے بھر دیتا تھا۔ کراہیں، شور، دور تک زبردست ٹیلوں کی طرح ابھرتے ہوئے پانی کی گرج اور قرب و جوار میں ہواؤں کے صاف صاف نظر آنے والے دھارے ــ کیونکہ ان کی بےمزاحمت رفتار انتہائی طوفانی ہوتی تھی ــ لونگرین کی اذیت‌زدہ روح پر ایسے بہرےپن کی، ایسی بےحسی کی کیفیت طاری کر دیتے تھے جو غم کو ناقابل بیان اداسی میں تبدیل کر دیتی ہے اور اپنے اثرات کے اعتبار سے بالکل گہری نیند جیسی ہوتی ہے۔

ایسا ہی ایک دن تھا جبکہ مینرس کے بارہ سالہ بیٹے ہین نے دیکھا کہ پل کے نیچے اس کے باپ کی کشتی کو لہریں بار بار ستونوں سے ٹکرا رہی ہیں اور اس کے

دونوں پہلوؤں کی صورت بگڑتی جا رہی ہے۔ اس نے جا کے مینرس کو اس کی اطلاع دی۔ طوفان کچھ ہی دیر قبل شروع ہوا تھا اور مینرس اپنی کشتی کو گھسیٹ کر ریت پر لانا بھول گیا تھا۔ وہ جلدی جلدی ساحل پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پل کے سرے پر لونگرین اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ہوا پائپ پی رہا ہے۔ اس کے سوا دور دور تک اور کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مینرس پل پر چلتا ہوا اس کے وسط تک پہنچا، وہاں سے نیچے اتر کے متلاطم پانی میں داخل ہوا اور اپنی کشتی کھولی۔ پھر وہ کشتی میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور ایک ستون کے بعد دوسرے کا سہارا لیتا ہوا ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اپنے چپو لے جانا بھول گیا تھا اور ایک بار کشتی پر لڑکھڑایا تو اگلے ستون کو نہ پکڑ سکا۔ ٹھیک اسی لمحے ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس کی کشتی کے اگلے حصے کو ستون سے الگ ہٹا کر اس کا رخ سمندر کی طرف کر دیا۔ اب اگر مینرس اپنے سارے جسم کو لمبائی میں پھیلا دیتا تب بھی اس کے ہاتھ قریب ترین ستون تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہوائیں اور لہریں کشتی کو تیزی سے ڈھکیلتی ہوئی دور، تباہی کی طرف لئے جا رہی تھیں۔ مینرس کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے سر پر بلا منڈلا رہی ہے اور اس نے پانی میں چھلانگ لگا کے تیرتے ہوئے باہر نکل آنے کا ارادہ کیا لیکن اس فیصلے میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ اب کشتی پل کے سرے کے قریب چکر کاٹ رہی تھی جہاں پانی کی کافی گہرائی اور لہروں کی غضب‌ناکی کے باعث موت یقینی تھی۔ مینرس سے جسے لہریں دور بہائے لئے جا رہی تھیں، لونگرین اس وقت صرف بیس میٹر کے فاصلے پر موجود تھا۔ اسے اب بھی بچایا جا سکتا تھا کیونکہ وزنی سرے والی لپٹی ہوئی ایک رسی لونگرین کے پہلو ہی میں پل سے لٹک رہی تھی۔ یہ رسی طوفان کے دوران ساحل پر پہنچنے والی کشتی کی مدد کے لئے رکھی رہتی تھی اور اسے پل پر سے کشتی پر پھینک دیا جاتا تھا۔

"لونگرین!" مینرس دہشت زدہ ہو کے چلایا۔ "وہاں یونہی کھڑے نہ رہو! دیکھ نہیں رہے ہو کیا کہ لہریں مجھے بہائے لئے جا رہی ہیں؟ رسی پھینکو نا!"

لونگرین نے جو اس بلحواس شخص کو بڑے سکون کے ساتھ دیکھ رہا تھا، کوئی جواب نہ دیا حالانکہ اس نے اپنے پائپ کا ایک گہرا کش لیا اور پھر جو کچھ ہو رہا تھا اسے بہتر طور پر دیکھنے کے لئے پائپ کو منہ سے ہٹا لیا۔

"لونگرین!" مینرس نے منت کی۔ "میں جانتا ہوں کہ تم میری آواز سن رہے ہو۔ ارے میں ڈوب جاؤں گا! مجھے بچاؤ!"

لیکن لونگرین اب بھی خاموش رہا۔ لگتا تھا جیسے اس نے اس مضطربانہ گریہ و بکا کو سنا ہی نہ ہو۔ اس نے تو اپنے جسم کا وزن تک ایک پیر سے دوسرے پر اس وقت تک منتقل نہ کیا جب تک کشتی سمندر میں اتنی دور نہ چلی گئی کہ مینرس کی چیخیں بمشکل ہی سنائی دیتی تھیں۔

دہشت‌زدہ مینرس سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے ملاح سے التجا کی کہ وہ مدد

کے لئے دوڑ کے ماہی‌گیروں کو بلا لائے، اس نے لونگرین کو انعام کا لالچ دیا، اسے دھمکیاں اور گالیاں دیں لیکن لونگرین نے کیا صرف یہ کہ پل کے بالکل کنارے تک چلا گیا تاکہ لہروں پر اچھلتی، چکر کھاتی ہوئی کشتی اس کی نظروں سے جلد اوجھل نہ ہو۔

"لونگرین، میری جان بچا لو!" یہ اُلفاظ اس کے کانوں تک یوں پہنچے جیسے چھت کے اوپر سے کسی کی آواز گھر کے اندر سنائی دے۔

اور تب لونگرین نے اپنے پھیپھڑوں کو گہری سانس لے کر پوری طرح بھر لیا تاکہ اس کے منہ سے نکلنے والا ایک بھی لفظ ہواؤں میں نہ دب جائے اور زور سے چلایا:

"اسی طرح وہ بھی تمہاری خوشامد کر رہی تھی! مینرس، ابھی جبکہ تم زندہ ہو، اس واقعے کا تصور کرو اور اسے نہ بھولو!"

آخرکار چیخیں تھم گئیں اور لونگرین گھر چلا گیا۔ اسول کی آنکھ رات میں کھل گئی تو اس نے اپنے باپ کو لیمپ کے سامنے جس کی لو دھیمی ہو چلی تھی، خیالوں میں کھوئے ہوئے بیٹھے دیکھا۔ لونگرین نے سنا کہ بچی اسے پکار رہی ہے تو اس نے قریب جا کے بڑی محبت سے اس کے رخسار کو چوما اور کمبل جو الٹ پلٹ گیا تھا، ٹھیک سے اوڑھا دیا۔

"سو جاؤ، میری پیاری۔ صبح ہونے میں ابھی بہت وقت باقی ہے" اس نے کہا۔

"لیکن آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"میں نے ایک سیاہ کھلونا بنایا ہے، اسول۔ اچھا، اب تم سو جاؤ۔"

اگلے روز مینرس کی گمشدگی کی خبر سارے گاؤں میں گونج اٹھی۔ پانچ دنوں کے بعد اسے واپس لایا گیا تو اس کی حالت غیر ہو چکی تھی اور اس کا دل لونگرین کے خلاف نفرت کے جذبات سے معمور تھا۔ اس کا قصہ جلد ہی قرب و جوار کے ایک ایک گاؤں میں پھیل گیا۔ مینرس شام تک کھلے سمندر میں رہا تھا۔ طوفانی لہروں سے جو لگتا تھا کہ کسی بھی وقت اس بدحواس دوکان‌دار کو سمندر میں اچھال دیں گی، بھیانک جدو جہد کے دوران کبھی اس کا جسم کشتی کے پہلوؤں سے اور کبھی پیندے سے بار بار ٹکراتا رہا تھا اور آخرکار کاسیٹ کی سمت جاتے ہوئے جہاز "لک ریشیا" نے اسے اس مصیبت سے نجات دلائی تھی۔ ہوا اور سردی میں کھلے رہنا اور اس ہولناک مصیبت کو جھیلنا اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ لونگرین کو ہر اس بلائے ناگہانی کی جو اس دھرتی پر اور خود اس کے تصور میں ممکن تھی، بددعا دیتا ہوا اڑتالیس گھنٹوں کے اندر ہی چل بسا۔ مینرس کا یہ قصہ کہ ملاح اسے موت کے منہ میں جاتے دیکھتا رہا اور مدد سے انکار کر دیا، اس لئے اور بھی زیادہ قابل یقین تھا کہ یہ دم

توڑتا ہوا شخص بڑی مشکل سے سانس لے پا رہا تھا اور مسلسل کراہے جا رہا تھا۔ اسے سن کے کپرنا کے لوگ ھکا بکا رہ گئے۔ ویسے تو ان میں شاید ھی کوئی ایسا رہا ہو جو لونگرین کی توھین سے کہیں بڑی اپنی توھین کو بھی یاد رکھتا یا جو اس طرح غمزدہ ہوتا جس طرح میری کے انتقال پر لونگرین کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک رہنا تھا، پھر بھی جس چیز نے ان سب کو متحیر اور بدحواس کر دیا وہ تھی لونگرین کی خاموشی۔ لونگرین وھاں ان آخری الفاظ کو ادا کرنے تک جو اس نے چیخ کر مینرس سے کہے تھے، بالکل خاموش کھڑا رہا تھا۔ وہ بےحس و حرکت، سختی اور خاموشی کے ساتھ کسی منصف کی طرح کھڑا ہوا مینرس سے اپنی شدید نفرت کا اظہار کرتا رہا تھا۔ نہیں، اس کی خاموشی میں کوئی ایسی کیفیت بھی تھی جو نفرت سے بڑی تھی اور گاؤں کے لوگوں نے اسے بھانپ لیا۔ لونگرین اگر چیخ اٹھا ہوتا، اگر اس نے کسی اشارے یا جوشیلے اقدام کے ذریعے بغلیں بجائی ہوتیں یا اگر اس نے مینرس کی مایوسی پر کسی دوسرے طریقے سے اپنے احساس فتحمندی کا مظاھرہ کیا ہوتا تو ماھی‌گیروں کے لئے اس کا رویہ قابل فھم ہوتا لیکن اس نے تو اس رویے سے مختلف رویہ اختیار کیا تھا جو ایسے موقعے پر عام ماھی‌گیروں نے اختیار کیا ہوتا۔ اس نے نہایت ھی موثر اور عجیب رویہ اختیار کیا تھا اور اس طرح خود کو ماھی‌گیروں سے بلند و برتر ثابت کر دیا تھا۔ مختصراً یہ کہ اس نے وہ کیا تھا جو ناقابل معافی ہوتا ھے۔ چنانچہ اب سڑک پر نہ کوئی اس سے سلام کرتا تھا نہ مصافحہ۔ لوگ تو اس کی طرف جان پہچان اور علیک سلیک کی دوستانہ نظریں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔ اب سے زندگی کے آخر تک اسے گاؤں کے معاملات سے بالکل الگ تھلگ رہنا تھا۔ سڑک پر لڑکے اسے دیکھ کے اس کے پیچھے سے زور سے چلاتے تھے: "لونگرین نے مینرس کو ڈبو دیا!" وہ اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ وہ اس بات پر بھی توجہ دیتا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ شراب خانے میں یا ساحل پر کشتیوں کے درمیان ماھی‌گیر اس کی موجودگی میں اپنی باتیں روک دیتے تھے اور یوں دور ھٹ جاتے تھے جیسے وہ طاعون کا مریض ہو۔ مینرس کے معاملے نے لونگرین اور ان لوگوں کی سابق جزوی بیگانگی کو مستحکم کر دیا۔ اس بیگانگی نے اپنی تکمیل کے بعد ایسی پائیدار باھمی نفرت کو جنم دیا جس کی پرچھائیوں سے اسول بھی محفوظ نہ رہ سکی۔

اسول بغیر دوستوں کے بڑھی پلی۔ گاؤں میں جو والدین کے مسلمہ اقتدار پر مبنی خاندانی حکمرانی کے کٹر اصولوں سے اس طرح شرابور تھا جیسے پانی سے کوئی اسپنج، اسول کی عمر کے دو تین درجن بچے تھے پر وہ بھی دنیا کے سارے بچوں ھی کی طرح اپنے بڑوں کے نقش قدم پر چلتے تھے اور انہوں نے ننھی اسول کو اپنے تحفظ اور دلچسپی کے حلقے سے ھمیشہ ھمیشہ کے لئے الگ کر دیا۔ بالکل فطری طور پر یہ صورت‌حال بتدریج، بالغوں کی ڈانٹ پھٹکار اور سرزنش کے ذریعے وجود میں آئی اور اس نے کسی مہیب ممنوعہ شے کی حیثیت اختیار کر لی جس کو فضول باتوں اور

افواھوں نے ھوا دی۔ نتیجه یه ھوا که بچوں کے ذھنوں میں ملاح کے گھر سے خوف کے جذبے نے جڑ پکڑ لی۔

اس کے علاوہ لونگرین کی گوشه نشینی کی زندگی نے اب الٹی سیدھی اڑانے والوں کی تیز و طرار زبانوں کو بھی کھلی چھوٹ دے دی۔ کہا جانے لگا که ملاح ضرور کہیں کسی شخص کو قتل کر چکا ھے اسی لئے اب اسے کسی جہاز پر نوکری نہیں مل رھی ھے اور وہ جو اتنا بدمزاج اور غیرملنسار ھے تو اس کا سبب صرف یه ھے که اس کا مجرم ضمیر کچوکے لگاتا رھتا ھے۔ اسول کھیلتے ھوئے بچوں کے قریب آ جاتی تو وہ اسے بھگا دیتے، اس پر کیچڑ اچھالتے اور یه کہه کر طعنے دیتے که اس کا باپ پہلے ادم‌خور تھا اور اب جعلی سکے بناتا ھے۔ بچوں سے دوستی کرنے سے متعلق اس کی بےتصنع کوششیں یکے بعد دیگرے تلخ آنسوؤں، خراشوں، کھرونچوں اور "رائے عامه" کے دوسرے اظھاروں پر منتج ھوئیں۔ آخرکار اس نے یه محسوس کرنا ھی ترک کر دیا که اس کی توھین کی جا رھی ھے پھر بھی وہ کبھی کبھی اپنے باپ سے پوچھ ھی بیٹھتی تھی:

"یه لوگ ھمیں پسند کیوں نہیں کرتے؟ ذرا بتائیے تو۔"

"اوہ اسول، انھیں پسند کرنا یا محبت کرنا آتا ھی نہیں۔ انسان میں محبت کر سکنے کی صلاحیت ھونی چاھئے اور یه ایک ایسی بات ھے جو ان کے بس میں نہیں۔"

"«صلاحیت ھونی چاھئے» سے آپ کا کیا مطلب ھے؟"

"یه!"

یه کہه کے لونگرین بچی کو گود میں اٹھاتا اور بڑی محبت کے ساتھ اس کی آنکھوں کو جنھیں وہ مسرت کے ساتھ بھینچ کے بند کر لیتی تھی، چوم لیتا۔

اسول کا محبوب تفریحی مشغله یه تھا که شام کو یا چھٹی کے دن جب اس کا باپ سریس کے برتنوں، اوزاروں اور نامکمل کھلونوں کو ایک طرف رکھ دیتا، اپرن اتار ڈالتا اور دانتوں میں پائپ دبا کر آرام کرنے بیٹھ جاتا تو وہ اس کی گود میں آ بیٹھتی۔ باپ کے بازو کے حفاظتی حلقے کے اندر کسمساتے اور ادھر ادھر مڑتے ھوئے وہ کھلونوں کے مختلف حصوں پر انگلیاں پھیرتی اور ھر ایک کی ضرورت اور اھمیت کے متعلق سوالات کرتی۔ اور اس طرح زندگی اور لوگوں کے متعلق نہایت ھی عجیب و غریب لیکچر شروع ھو جاتا جس میں لونگرین کی سابق زندگی کی بنا پر طرح طرح کے اتفاقی سانحوں اور عام اتفاقات کو، عجیب و غریب، حیرت انگیز اور غیرمعمولی نوعیت کے واقعات کو نمایاں کردار حاصل ھوتا۔ لونگرین اپنی بیٹی کو مختلف رسوں، بادبانوں اور جہازوں کے دوسرے ساز و سامان کے نام بتاتا اور پھر دھیرے دھیرے خیالات کی رو میں بہه نکلتا۔ وہ مختلف واقعات کی جن میں کبھی کسی آھنجے، کبھی کسی پتوار اور کبھی کسی مستول یا کسی خاص بناوٹ کی کشتی یا جہاز نے کوئی کردار ادا کیا تھا،

سیدھی سادی تفصیلات سے بات شروع کرتا اور پھر دھیرے دھیرے الگ الگ واقعات کے اس بیان سے بڑھ کر شبانہ گشتوں کے عمومی تذکروں پر آ جاتا جن کے دوران توھم کو حقیقت سے اور حقیقت کو اپنے تخیل کی تخلیق کردہ شبیہوں سے جوڑ دیتا۔ اب کبھی جہاز کی غرقابی کا منحوس پیامی بن‌بلاؤ نمودار ھوتا، کبھی بولتی ھوئی اڑنے والی مچھلی جس کے احکام کی راہ بھٹک جانے کے اندیشے کے باوجود تعمیل کرنی پڑتی تھی اور کبھی فلائنگ ڈچمین اور اس کا وحشی عملہ، نشانات، شگون، بنات البحر اور بحری قزاق۔ مختصر یہ کہ وہ ایسے سب قصے سنا ڈالتا تھا جو سمندر کے پرسکون ھونے کے وقت یا کسی پسندیدہ شراب‌خانے میں ملاحوں کے وقت گزارنے میں معاون ثابت ھوتے ھیں۔ لونگرین تباہ ھو جانے والے جہازوں کے عملے کے متعلق، ان لوگوں کے متعلق جو وحشی ھو گئے تھے، بھول گئے تھے کہ باتیں کیسے کی جاتی ھیں، پراسرار دفینوں، قیدیوں کی بغاوتوں اور بہت سی دوسری چیزوں کے متعلق بھی باتیں کیا کرتا تھا جنھیں چھوٹی بچی ایسی محویت کے ساتھ سنا کرتی تھی جس سے شاید کولمبس کے اولین سامعین نے کسی نئے براعظم کے متعلق اس کے قصے بھی نہ سنے ھوں‌گے۔ "کچھ اور بتائیے نا" اسول اس وقت اصرار کرتی جب خیالوں میں کھویا ھوا لونگرین خاموش ھو جاتا اور پھر وہ انھی قصوں کو سنتے سنتے، ذھن میں شاندار خوابوں کو بسائے ھوئے اس کے سینے ھی پر سو جاتی تھی۔

لونگرین جو کچھ بناتا تھا اسے خوشی خوشی خرید لینے والی کھلونوں کی دوکان کے کلرک کی شہر سے آمد اسول کے لئے ھمیشہ ھی بہت بڑا اور مادی طور پر مفید واقعہ ثابت ھوتی تھی۔ یہ کلرک لونگرین کی خوشنودی حاصل کرنے اور سستا سودا پٹانے کے لئے دو تین سیب، ایک میٹھا کلچہ اور مٹھی بھر اخروٹ لانا نہیں بھولتا تھا۔ لونگرین عموماً کھلونوں کی اصلی قیمت ھی طلب کرتا تھا کیونکہ مول بھاؤ سے اسے نفرت تھی لیکن کلرک قیمت گھٹانے لگتا۔ "دیکھو نا" لونگرین کہتا، "مجھے اس کشتی کو بنانے میں پورا ایک ھفتہ لگا ھے۔ (کشتی نو انچ لمبی تھی۔) ذرا غور تو کرو کہ یہ کتنی مضبوط اور کیل کانٹے سے کیسی درست ھے۔ یہ تو طوفان کے وقت بھی پندرہ آدمیوں کا بار برداشت کر لےگی۔" آخرکار چھوٹی لڑکی منہ ھی منہ میں کچھ کہنے لگتی، اپنے سیب کی اھمیت کو نمایاں کرنے لگتی اور لونگرین کا سارا عزم، مول بھاؤ کی ساری خواھش جواب دے جاتی۔ وہ راضی ھو جاتا اور کلرک مہارت کے ساتھ بنائے گئے عمدہ کھلونوں سے اپنی ٹوکری بھر کے دل ھی دل میں ھنستا ھوا چل دیتا۔

گھر کے سارے کام لونگرین خود ھی کیا کرتا تھا۔ وہ لکڑیاں چیرتا، پانی لاتا، آتش‌دان جلاتا، کھانا پکاتا، کپڑے دھو کے استری کرتا اور اس سب کے ساتھ ھی روزی کمانے کا وقت بھی نکال لیتا تھا۔ اسول آٹھ برس کی ھو گئی تو باپ نے اسے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ وہ کبھی کبھی اسے اپنے ساتھ شہر بھی لے جانے لگا اور کچھ دنوں کے

بعد دوکان سے کچھ پیشگی رقم حاصل کرنے یا نئے کھلونے دینے کے لئے اسے اکیلے بھی بھیجنے لگا۔ لیکن بس کبھی کبھار ھی۔ یوں تو کپرنا گاؤں سے لیس صرف چار میل کے فاصلے پر واقع تھا لیکن سڑک جنگل سے ھو کر گزرتی تھی اور جنگل میں بہت کچھ ہوتا ھے جو کسی بھی بچے کو خوف‌زدہ کر سکتا ھے۔ جسمانی خطرے کا بھی سوال تھا جس کی ویسے تو شہر سے اتنی قریب جگہ پر توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن محتاط رهنے کی ضرورت تو بہرحال تھی ھی۔ اسی لئے لونگرین اسے صرف اچھے دنوں ھی میں اور وہ بھی صبح کو اکیلے شہر جانے دیتا تھا جبکہ سڑک کے کنارے کنارے سارا جنگلی علاقه دھوپ میں نہایا ھوتا تھا، چاروں طرف پھول ھی پھول ھوتے اور سناٹا چھایا رهتا تھا۔ وہ نہیں چاهتا تھا کہ اسول کی زود اثر پذیری کو اس کے تخیل کے ایجاد کردہ کسی بھوت پریت سے خطرہ لاحق ھو۔

ایک روز اسول شہر جاتے ھوئے آدھے راستے میں اس میٹھے کلچے کو کھانے کے لئے جسے وہ اپنے ساتھ لائی تھی، سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران اس نے باری باری ھر کھلونے کو اٹھا اٹھا کے دیکھا۔ ان میں سے دو تین اس کے لئے نئے تھے جنہیں لونگرین نے رات میں بنایا تھا۔ ایک نیا کھلونا دوڑ میں استعمال کی جانے والی کشتی کا نمونہ تھا۔ اس چھوٹی سی سفید کشتی کے ارغوانی بادبان اس ریشم کے ٹکڑوں کے تھے جس سے لونگرین امیر گاھکوں کے لئے بنائے ھوئے کھلونوں کے کیبنوں کی دیواریں ڈھک دیا کرتا تھا۔ کشتی بنانے کے بعد اسے بادبانوں کے لئے کوئی معقول کپڑا نہیں ملا تھا اس لئے اس نے اسی ارغوانی ریشم کے بچے کھچے ٹکڑے ھی استعمال کر لئے تھے۔ اسول بہت خوش ھوئی۔ انگارے جیسا گہرا شوخ رنگ اس کے ھاتھ میں کچھ اس طرح چمک رھا تھا کہ اسے لگا جیسے وہ ھتھیلی پر آگ رکھے ھوئے ھو۔ قریب ھی ایک چھوٹی سی ندی راستے کو کاٹتی ھوئی بہہ رھی تھی جس کے اوپر کیلوں سے جڑی ھوئی بلیوں کا ایک پل بنا ھوا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب ندی جنگل میں بہتی تھی۔ "میں اسے ذرا دیر کے لئے پانی پر رکھ دوں‌گی تو یہ بھیگ تھوڑی جائےگی" اسول نے سوچا، "میں اسے پونچھ کے خشک بھی کر سکتی ھوں۔" وہ ندی کے بہاؤ کے رخ پر ذرا دور تک جنگل میں گئی اور اس کشتی کو جو اسے اچانک بہت پسند آ گئی تھی، احتیاط کے ساتھ پانی پر رکھ دیا۔ دوسرے ھی لمحے بادبانوں کے ارغوانی رنگ کا عکس صاف و شفاف پانی میں نظر آیا۔ ریشم سے پھوٹتی ھوئی لو تہہ کے پتھروں پر تھرتھراتی ھوئی گلابی روشنی کی طرح نمودار ھو گئی تھی۔ "تم کہاں سے آ رھے ھو، کپتان؟" اسول نے ایک خیالی کردار کی نہایت ھی سنجیدہ آواز میں پوچھا اور پھر اپنے سوال کا خود ھی جواب دیا: "میں آیا ھوں... آیا ھوں... چین سے۔" "اور تم لائے کیا ھو؟" "یہ ایسی بات ھے جو مجھے تم سے نہ بتانی چاھئے۔" "اچھا تو تم نہ بتاؤگے، کپتان؟ خیر، تب تو تم ٹوکری میں واپس جاؤ۔" ٹھیک اسی لمحے جب کپتان ندامت ظاھر کرنے والا تھا، کہنے جا رھا تھا کہ میں تو محض مذاق

کر رہا تھا، ابھی ابھی بخوشی تمہیں ایک ہاتھی دکھاتا ہوں، کنارے سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہوئی ایک ہلکی سی لہر نے کشتی کا ماتھا ندی کی طرف موڑ دیا اور یہ کسی اصلی جہاز کی طرح پوری رفتار کے ساتھ کنارے سے روانہ ہو کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہہ نکلی۔ اسول کے ماحول کا پیمانہ پلک جھپکتے ہی میں بدل گیا: چھوٹی سی ندی اسے زبردست دریا معلوم ہونے لگی اور ننھی سی کشتی دوری پر موجود بہت بڑا جہاز جس کی طرف اس نے پانی میں تقریباً گرتے ہوئے خوف سے گم صم ہو کے اپنے ہاتھ پھیلا دئے۔ "بچارا کپتان سہم گیا" لڑکی نے نتیجہ اخذ کیا اور نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے کھلونے کے تعاقب میں اس امید کے ساتھ دوڑ پڑی کہ کچھ دور آگے جانے کے بعد یہ بہہ کے کنارے آ لگےگا۔ وہ ہلکی لیکن بہرحال حارج ثابت ہونے والی ٹوکری کو گھسیٹتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے باز بار کہے جا رہی تھی: "توبہ! آخر یہ ہو کیسے گیا؟ عجب حادثہ ہے..." بادبانوں کے خوبصورت مثلث کو جو بڑے وقار کے ساتھ تیزی سے بہتا چلا جا رہا تھا، نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کے گر پڑی اور اٹھ کے دوبارہ دوڑنے لگی۔

اسول نے اس سے پہلے کبھی بھی جنگل میں اتنی دور تک داخل ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ کھلونے کے پاس تک پہنچنے کی بےتابانہ خواہش میں اتنی زیادہ کھوئی ہوئی تھی کہ اپنے گرد و پیش پر توجہ نہیں دے رہی تھی۔ ویسے راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹیں ہی اس کی توجہ مبذول کرانے کے لئے کیا کم تھیں۔ گرے ہوئے درختوں کے تنے جن پر کائی جمی ہوئی تھی، گڈھے، فرن کے اونچے اونچے درخت، جنگلی گلاب، چنبیلی اور ہیزل کی جھاڑیاں قدم قدم پر اس کا راستہ روک لیتی تھیں۔ ان سے بچ بچا کے نکلنے کی کوشش کرتے کرتے دھیرے دھیرے وہ تھک گئی اور جلدی جلدی ٹھہرنے لگی: کبھی دم لینے کے لئے تو کبھی منہ سے چمٹ جانے والے مکڑی کے جالے کو چھڑانے کے لئے۔ زیادہ کشادہ جگہوں پر سیج گھاس اور نرکل کی گھنی جھاڑیاں نمودار ہوتیں اور ارغوانی چمکتے ہوئے بادبان اس کی نظروں سے تقریباً اوجھل ہو جاتے لیکن کسی موڑ کو تیزی سے پار کرنے کے بعد اسے وہ ہوا کے سہارے بہت وقار اور استقلال سے آگے بڑھتے ہوئے دوبارہ نظر آ جاتے۔ ایک بار اس نے مڑ کر دیکھا اور جنگل نے اپنے بہت سے رنگوں کے ساتھ، پتیوں کے درمیان دھندلی دھندلی روشنی اور گھنی تیرگی کے ٹکڑوں کے ساتھ متحیر کر دیا۔ لمحے بھر کے لئے وہ سہم کر رہ گئی لیکن پھر اسے کھلونا یاد آیا اور متعدد بار "ہونہہ" کہہ کر دوبارہ انتہائی تیزی سے دوڑنے لگی۔

بدحواس کر دینے والے اس بےسود تعاقب میں تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا جس کے بعد اسول کو یہ دیکھ کر تعجب اور اطمینان ہوا کہ اس کے آگے درخت ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر کھڑے ہیں اور درمیانی جگہ سے نیلگوں سمندر کا ایک حصہ، بادل اور زرد زرد سی ریت کے راس کا کنارا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی

اسی راس تک پہنچی اور تھکن سے نڈھال ہونے کی بنا پر اس پر گرتے گرتے بچی۔ یہ اس ننھی ندی کا دھانہ تھا، قدرے کشادہ اور خاصا اتھلا جس کی وجہ سے تہہ کے پتھروں کی نیلاھٹ نظر آ رہی تھی۔ یہاں یہ ندی ساحل کی طرف آتی ہوئی سمندری لہروں سے ہمآغوش ہو گئی تھی۔ درختوں کی ابھری ہوئی جڑوں والے اس راس کے سرے پر کھڑی ہوئی اسول کو ندی کے کنارے ایک بھاری، چپٹے پتھر پر اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہوا ایک شخص نظر آیا جو مفرور کشتی کو اپنے ھاتھوں میں کسی ایسے ھاتھی کے تجسس سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جس نے تتلی پکڑ لی ہو۔ اسول ڈھال سے پھسل کے نیچے اتری، اجنبی کے پاس پہنچی اور اس کے سر اٹھانے کا انتظار کرتے ہوئے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ تاھم اجنبی اس کھلونے کو جس نے جنگل میں اسے متحیر کر دیا تھا، دیکھنے میں اتنا زیادہ کھویا ہوا تھا کہ لڑکی کو اس کے سراپا کا جائزہ لینے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کا وقت مل گیا کہ اس کا جیسا آدمی اس نے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھا۔

یہ آدمی دراصل ایگل تھا، گیتوں، داستانوں اور پریوں کی کہانیوں کا مشہور جامع جو علاقے کے پیدل دورے پر نکلا تھا۔ اس کے سفید بالوں کے گچھے چٹائی کی ھیٹ کے نیچے سے نکلے ہوئے لہرا رہے تھے اور نیلے پتلون کے اندر ٹھنسے ہوئے سفید کرتے اور لانگ بوٹوں کی بنا پر وہ شکاری جیسا معلوم ہوتا تھا۔ سفید کالر، ٹائی، نقرئی پتروں سے آراستہ پیٹی، چھڑی اور نکل کے چمکدار بکسوے والی تمباکو رکھنے کی چرمی تھیلی — سب کچھ بتا رہا تھا کہ وہ شہر کا رہنے والا ہے۔ اس کا چہرہ اگر کانٹوں کی مدد سے سنواری ہوئی جھاڑی جیسی داڑھی اور نہایت ھی گھنی، بھیانک انداز سے بٹی ہوئی مونچھوں کے اندر سے جھانکتی ہوئی ناک، لبوں اور آنکھوں کو چہرہ کہا جا سکتا تو پلپلا اور نیم شفاف معلوم ہوتا بشرطیکہ اس کی آنکھیں ریت کی جیسی بھوری اور خالص لوھے کی جیسی چمکدار نہ ہوتیں اور نگاہ انتہائی بےباک اور تیز نہ ہوتی۔

"اچھا اب اسے واپس کر دیجئے" لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سے کافی کھیل چکے۔ آپ نے اسے پکڑا کیسے؟"

ایگل نے نظریں اٹھائیں اور کشتی اس کے ھاتھوں سے نیچے گر گئی کیونکہ اسول کی پرجوش آواز نے بالکل اچانک ھی خاموشی کا طلسم توڑ دیا تھا۔ ذرا دیر تک یہ سنرسیدہ شخص لڑکی کو تکتا، مسکراتا اور ھتھیلی کو پیالے کی شکل دئے داڑھی کو اس میں ڈالتے نکالتے ہوئے دھیرے دھیرے سہلاتا رہا۔ اکثر دھوئی جانے والی چھوٹی سی سوتی فراک لڑکی کے ہڑیلے، دھوپ سے سونلائے ہوئے گھٹنوں کو بمشکل ھی ڈھک پا رہی تھی۔ اس کے کالے کالے گھنے بال جو لیس کے رومال سے بندھے ہوئے تھے، کھل کر شانوں پر لہرا رہے تھے۔ چہرے کی ہر چیز عمدگی سے ترشی ترشائی اور ابابیل کی پرواز جیسی نفیس تھی۔ اس کی آنکھوں میں جو چہرے کی بہ نسبت

زیادہ عمر کی معلوم ہوتی تھیں، ایک طرح کی اداسی اور تجسس کی جھلک پائی جاتی تھی۔ بیضوی چہرے پر جلد کی صحت‌مند سفیدی سے مخصوص ہلکی ہلکی خوبصورت سونلاہٹ جلوہ‌گر تھی اور چھوٹے چھوٹے کھلے ہوئے ہونٹوں پر رقصاں تھی نرم مسکراہٹ۔

"میں گریم بھائیوں، ایسوپ اور اینڈرسن کی قسم کھا کے کہتا ہوں" ایگل نے لڑکی پر سے نظریں ہٹا کے کشتی کو دیکھتے ہوئے کہا، "کہ یہ کوئی بہت ہی انوکھا معاملہ ہے! سنو میری پیاری! یہ تمہاری ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں اس کے پیچھے ندی کے کنارے کنارے اتنی دور سے دوڑتی چلی آ رہی ہوں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ میری جان ہی نکل جائےگی۔ کیا یہ یہاں آ گئی تھی؟"

"ہاں، بالکل میرے قدموں میں۔ کشتی کے چٹان سے ٹکرا جانے نے میرے لئے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ بحری قزاق کا کردار ادا کرتے ہوئے میں یہ انعام تمہیں پیش کر دوں۔ بچاری کشتی کا سارا عملہ اسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اسے تین انچ کی ایک لہر نے اچھال کے کنارے لگا دیا اور یہ میری بائیں ایڑی اور میری چھڑی کی نوک کے درمیان آ کے رک گئی۔" اس نے اپنی چھڑی کی نوک زمین پر ماری۔ "تمہارا نام کیا ہے، بیٹی؟"

"اسول" لڑکی نے ایگل کے دئے ہوئے کھلونے کو ٹوکری میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" پھر بوڑھے نے اپنی آنکھیں جن کی گہرائیوں میں شفقت اور دوستی کی مسکراہٹ چمک رہی تھی، لڑکی پر سے پل بھر کو بھی ہٹائے بغیر اپنی غیرواضح گفتگو جاری رکھی: "دراصل مجھے تم سے نام پوچھنا ہی نہ چاہئے تھا۔ بہرحال مجھے خوشی ہوئی کہ تمہارے نام میں اتنی سسکار، اتنی نغمگی ہے جیسے کسی تیر کے گزرنے سے پیدا ہونے والی سیٹی یا کسی بحری سیپی کی سرگوشی۔ میں بھلا کیا کرتا اگر تمہارا نام ان خوشگوار لیکن بہت ہی عام ناموں میں سے ایک ہوتا جو "عظیم نامعلوم" کے لئے بالکل اجنبی ہوتے ہیں؟ اس سے بھی کم دلچسپی مجھے یہ جاننے سے ہے کہ تم کون ہو، تمہارے والدین کون ہیں یا یہ کہ تم کیسی زندگی گزار رہی ہو۔ طلسم کو توڑا ہی کیوں جائے؟ یہاں میں اس پتھر پر بیٹھا ہوا فن‌لینڈ اور جاپان کی کہانیوں کے پلاٹوں کا موازنہ کر رہا تھا... اتنے میں اچانک ندی اس کشتی کو بہا کے لے آئی اور پھر تم نمودار ہوئیں۔ جیسی کہ تم اصل میں ہو۔ میں دل سے شاعر ہوں، میری بیٹی، حالانکہ میں نے کبھی کچھ بھی نہیں لکھا۔ تمہاری ٹوکری میں کیا ہے؟"

"کشتیاں" اسول نے ٹوکری کو ہلاتے ہوئے کہا، "اور ایک جہاز اور تین چھوٹے چھوٹے گھر جن پر جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ ان گھروں میں سپاہی رہتے ہیں۔"

"بہت خوب۔ تم انہیں فروخت کرنے کے لئے بھیجی گئی ہو۔ اور راستے میں تم کھیلنے کے لئے ٹھہر گئیں۔ تم نے کشتی کو ذرا دیر تک تیرنے کا موقع دیا لیکن یہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"آپ دیکھ رہے تھے کیا؟" اسول نے یہ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہ یہ سارا قصہ کہیں خود اسی نے تو نہیں بتایا تھا، شک بھرے لہجے میں پوچھا۔ "آپ سے کسی نے بتایا ہے کیا؟ یا آپ نے خود ہی قیاس کر لیا ہے؟"

"میں جانتا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میں سب سے بڑا جادوگر ہوں۔"

اسول بوکھلا سی گئی۔ ایگل کے ان الفاظ پر اس کے اندر پیدا ہونے والا ہیجان خوف سے بھی تجاوز کر گیا۔ سنسان ساحل، چاروں طرف چھایا ہوا سناٹا، کشتی کی تھکا مارنے والی مہم، چمکیلی آنکھوں والے بوڑھے کی عجیب و غریب باتیں اور اس کی داڑھی اور سر کے بالوں کی شان ــ سب کچھ بچی کو واہمے اور حقیقت کا امتزاج سا معلوم ہوا۔ اس لمحے ایگل نے منہ بنا دیا ہوتا یا چیخ پڑتا تو اسول روتی پیٹتی بھاگ کھڑی ہوتی، خوف سے بےہوش ہو جاتی۔ لیکن ایگل نے یہ دیکھ کر کہ بچی کی آنکھیں کس طرح کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں، فوراً ہی گفتگو کا رخ موڑا۔

"تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں" اس نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "اس کے برعکس میں تو تم سے بےتکلفی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

آخرکار اب کہیں جا کر ایگل کی سمجھ میں آیا کہ لڑکی کے چہرے میں وہ کون سی چیز تھی جس سے وہ اتنا زیادہ متاثر ہو گیا تھا۔ "ایک خوبصورت، پرمسرت مقدر کی نادانستہ توقع" اس نے نتیجہ اخذ کیا۔ «آخر میں ادیب کیوں نہیں پیدا ہوا تھا؟ افسانے کا یہ کتنا شاندار موضوع ہے۔»

"اچھا تو پھر" ایگل نے اپنے قائم کردہ اس تصور کو آخری شکل دینے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی (خیالی قصے کی تخلیق کا جذبہ جو اس کے روزمرہ کام کا نتیجہ تھا، شاندار خوابوں کے بیج انجانی مٹی میں بو دینے کے خوف سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا)، "اچھا تو اسول، غور سے سن لو۔ میں کچھ دیر پہلے تک اسی گاؤں میں تھا جہاں سے شاید تم آ رہی ہو۔ میرا مطلب ہے کپرنا میں۔ مجھے پریوں کی کہانیاں اور لوک گیت بہت پسند ہیں اور میں نے اس گاؤں میں سارا کا سارا دن کوئی ایسی چیز سننے کی آس لگائے لگائے کاٹ دیا جسے اس سے پہلے کسی نے نہ سنا ہو۔ پر اس گاؤں میں تو پریوں کی کہانیاں کوئی سناتا ہی نہیں۔ یہاں گیت تو کوئی گاتا ہی نہیں۔ لوگ کہانیاں کہتے اور گیت گاتے بھی ہیں تو وہ بس چشم پوشی کرنے والے کسانوں اور سپاہیوں ہی کی کہانیاں ہوتی ہیں جن میں ہمیشہ ہی بدمعاشی کو سراہا جاتا ہے۔ اور یہ چار مصرعوں کے، واہیات دھنوں کے گائے جانے

والے مختصر گیت، یہ تو بے دھلے پیروں کی طرح گندے اور گڑگڑاتے ہوئے پیٹ کی طرح بھونڈے ہوتے ھیں... لیکن ٹھہرو، میں خیالوں کی رو میں بہہ گیا۔ میں اپنی بات پھر سے شروع کروں گا۔"

وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر کہنے لگا:

"میں کہہ نہیں سکتا کہ کتنے برس بیت جائیں گے لیکن بہر حال ایک روز کپرنا میں پریوں کی ایک کہانی جنم لےگی اور بہت دنوں تک لوگ اسے یاد رکھیں گے۔ اس وقت تم بڑی ہو چکی ہوگی، اسول۔ ایک روز دور، افق پر ایک ارغوانی بادبان چمک اٹھےگا۔ جہاز سفید ہوگا اور اس کے ارغوانی بادبانوں کا چمکتا ہوا ستون لہروں کو کاٹتا ہوا سیدھا تمہاری طرف بڑھےگا۔ ہاں تو یہ شاندار جہاز بالکل خاموشی سے تیرتا ہوا قریب آئےگا، نہ چیخ پکار ہوگی نہ توپیں سلامی دیں گی۔ ساحل پر بہت بڑی بھیڑ اکٹھا ہو جائےگی۔ ہر شخص حیران و ششدر ہوگا اور اس مجمعے میں تم بھی موجود ہوگی۔ جہاز شاہانہ انداز میں تیرتا ہوا، موسیقی کی دلنواز آوازوں کے ساتھ بالکل ساحل تک آ جائےگا اور اس سے تیز رفتار کشتی جو قالینوں، پھولوں اور سونے سے آراستہ ہوگی، پانی میں اتاری جائےگی۔ «تم کیوں آئے ہو؟ تمہیں کس کی تلاش ھے؟» ساحل سے لوگ پوچھیں گے۔ اتنے میں تمہاری نظر ایک بہادر اور خوبصورت شہزادے پر پڑےگی جو کشتی میں تمہاری طرف ھاتھ بڑھائے کھڑا ہوگا۔ «کہو، اسول!» وہ تم سے مخاطب ہوگا۔ «یہاں سے دور، بہت ھی دور جگہ پر میں نے تمہیں خواب میں دیکھا اور اب تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنی سلطنت میں لے جانے کے واسطے یہاں آیا ہوں۔ وھاں تم گلابوں کی ایک وادی میں میرے ساتھ زندگی بسر کروگی۔ تمہارا دل جس چیز کی بھی تمنا کرےگا، تمہیں میسر ہوگی۔ ہم دونوں اتنے خوش و خرم ہوں گے کہ تمہاری روح کو اشکوں اور غموں کا مفہوم تک نہ معلوم ہو سکےگا۔» وہ تمہیں اپنی کشتی پر سوار کر کے جہاز تک لے جائےگا اور تم ہمیشہ کے لئے اس شاندار سرزمین کو روانہ ہو جاؤگی جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ھے اور جہاں تمہاری آمد کا ستارے آسمان سے اتر کر خیرمقدم کریں گے۔"

"اور کیا یہ سب میرے لئے ہوگا؟" لڑکی نے دھیرے سے پوچھا۔ اس کی سنجیدہ آنکھوں میں خوشی ناچنے لگی اور وہ اعتبار کے جذبے سے چمک اٹھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ کوئی خطرناک جادوگر کبھی بھی ایسی باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایگل سے کچھ اور قریب ہو گئی۔ "شاید وہ جہاز... آ بھی چکا ھے؟"

"ارے ایسی بےصبری بھی کیا" ایگل نے اعتراض کیا۔ "پہلے تو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، تم کو بڑی ہونا ھے۔ تب... باتیں کرنے کی کیا ضرورت ھے؟ سب کچھ یوں ھی ہوگا، یہ ھے سارا قصہ۔ اس وقت تم کیا کروگی؟"

"میں؟" اس نے ٹوکری میں دیکھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے معقول

انعام کے لائق کوئی چیز نہ مل سکی۔ "میں شہزادے سے محبت کروں‌گی" اس نے تیزی سے کہا اور پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے اضافہ کیا، "اگر وہ لڑے جھگڑےگا نہیں۔"

"ارے نہیں، وہ ایسا نہ کرےگا" جادوگر نے اسے پراسرار انداز سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑے جھگڑےگا نہیں۔ میں اس کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ اچھا اب جاؤ بیٹی اور میں نے ذائقےدار وادکا کی دو چسکیوں اور قیدیوں کے گیتوں پر اپنے غور و خوض کے درمیان جو کچھ تمہیں بتایا ہے اسے نہ بھولنا۔ جاؤ، تمہارا یہ خوبصورت سر سلامت رہے!"

لونگرین اپنے چھوٹے سے باغ میں آلو کے پودوں پر مٹی چڑھا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ اسول جس کے چہرے پر مسرت اور بےصبری کی کیفیت طاری تھی، دوڑتی ہوئی اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔

"سنیے..." اس نے اپنی سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے باپ کے اپرن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ "سنیے، میں آپ سے کیا کہنے جا رہی ہوں... ساحل پر... یہاں سے بہت دور ایک جادوگر رہتا ہے..."

اس نے اپنے قصے کا آغاز جادوگر اور اس کی شاندار پیش‌گوئی سے کیا۔ جوش و خروش کی بنا پر اسے واقعات کے مربوط تذکرے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ پھر اس نے جادوگر کا حلیہ بیان کیا اور آخر میں مفرور کشتی کے تعاقب کی روداد۔

لونگرین نے اس کا قصہ بیچ میں ایک بار بھی ٹوکے یا مسکرائے بغیر سنا اور اسول اپنی بات ختم کر چکی تو اس کے تخیل نے تیزی کے ساتھ اس اجنبی کی تصویر بنا لی جو اپنے ایک ہاتھ میں ذائقےدار وادکا کا فلاسک پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے میں کھلونا۔ اس نے اسول کی طرف سے منہ موڑ لیا لیکن یہ یاد کر کے کہ بچوں کی زندگی کے اہم موقعوں پر سنجیدگی اور تحیر کا تاثر دینا ہوتا ہے، اس نے سنجیدگی سے سر ہلایا اور کہا:

"اچھا تو یہ بات ہے... لگتا ہے وہ واقعی جادوگر ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہوں‌گا۔ لیکن اگلی بار جب تم شہر جانا تو سڑک چھوڑ کے ادھر ادھر نہ بھٹکنا، جنگل میں کھو جانا بہت آسان ہوتا ہے۔"

وہ کھرپے کو ایک طرف رکھ کے ٹٹی کے نیچے جنگلے کے پاس بیٹھ گیا اور لڑکی کو گود میں بٹھا لیا۔ تھکن سے چور اسول نے چند اور تفصیلات بیان کرنے کی کوشش کی لیکن گرمی، سنسنی اور تھکن کے باعث اونگھنے لگی۔ اس کی پلکیں جھپک گئیں، سر باپ کے طاقتور شانے سے ٹک گیا اور وہ گہری نیند سو جانے ہی کو تھی کہ اچانک ایک شک سے پریشان ہو کے بند آنکھوں کے ساتھ ہی سیدھی بیٹھ گئی اور اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیاں لونگرین کی واسکٹ میں ٹھونستے ہوئے کہہ اٹھی:

"آپ کے خیال میں جادو کا وہ جہاز میرے لئے واقعی آئےگا؟"

"آئےگا" ملاح نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ "اگر تم سے کہا گیا ہے کہ جہاز آئےگا تو اس کا مطلب ہے کہ ضرور آئےگا۔"

«بڑی ہونے تک اسول اس سارے قصے کو بھول بیٹھےگی» لونگرین نے اپنے آپ سے کہا، «اور اس اثنا میں تم کو ایسے شاندار کھلونے سے محروم نہ کیا جانا چاھئے۔ مستقبل میں تم جانے کتنے ہی بادبان دیکھوگی اور یہ بادبان ارغوانی نہیں بلکہ گندے اور فریبی ہوںگے، دور سے سفید اور تابناک معلوم ہوںگے لیکن قریب سے خستہ حال اور میلے کچیلے۔ کسی مسافر کو میری بیٹی سے مذاق کرنے کی سوجھی تو کیا ہوا؟ یہ تو محبت بھرا مذاق تھا! اچھا مذاق! توبہ، تم کتنی زیادہ نڈھال ہو چکی ہو! آدھا دن جنگل کے بیچوں بیچ بھٹکتے ہوئے گزار دیا۔ جہاں تک ارغوانی بادبانوں کا تعلق ہے تو ان کے متعلق تم بھی وہی سوچو جو میں سوچتا ہوں: تم کو یہ ارغوانی بادبان ضرور ملیں گے۔»

اسول سو گئی۔ لونگرین نے اپنے خالی ھاتھ سے پائپ نکال کے سلگایا جس کے دھوئیں کو ہواؤں نے جنگلے کے اندر سے ایک جھاڑی تک پہنچا دیا جو باغ کے باھر اگی ہوئی تھی۔ اسی جھاڑی کے پاس جنگلے کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ایک نوجوان بھکاری بیٹھا گوشت کا سموسہ کھا رہا تھا۔ وہ باپ بیٹی کی بات چیت سن کے بہت محظوظ ہوا تھا اور عمدہ تمباکو کی مہک نے اس کے اندر کے طفیلی کو بیدار کر دیا۔

"مجھ غریب کو کچھ تمباکو دے دیجئے، جناب" اس نے جنگلے کے پیچھے سے کہا۔ "آپ کی تمباکو کے مقابلے میں میری تو خالص زھر ہی ہے۔"

"ضرور دے دیتا" لونگرین نے دبی زبان سے جواب دیا، "لیکن میری تمباکو کی تھیلی میری جیب میں ہے اور میں نہیں چاھتا کہ میری بیٹی جاگ جائے۔"

"یہ بھی کیسی مصیبت ہے! وہ جاگ کے دوسرے ہی لمحے پھر سو جائےگی لیکن اس بیچ آپ ایک راہ‌گیر کو سگریٹ بھر کی تمباکو دے دیں گے۔"

"ایسا تو ہے نہیں کہ تمہارے پاس تمباکو بالکل ہی نہ ہو" لونگرین نے جواب دیا، "اور لڑکی تھکن سے چور چور ہے۔ ایسی ہی ضرورت ہو تو بعد میں آ جانا۔"

بھکاری نے بھنا کے زمین پر تھوکا، اپنا تھیلا ڈنڈے میں لٹکایا اور لونگرین پر طنز کرتے ہوئے کہا:

"ہاں ہاں صاحب، آپ کی بیٹی شہزادی جو ٹھہری۔ بچاری کو بھانت بھانت کے خیالی جہازوں کے چکر میں مبتلا کر رہے ہیں۔ واقعی آپ کا بھی کوئی جواب نہیں اور طرہ یہ کہ جائداد والے بھی ہیں!"

"سنو" لونگرین نے بڑی دھیمی آواز سے کہا، "میرا خیال ہے کہ میں اسے جگا تو دوں‌گا لیکن صرف اس لئے کہ مجھے تمہارے چہرے کی درگت بنانی ہوگی۔ اب یہاں سے کھسک تو لو!"

نصف گھنٹے بعد یہ بھکاری کوئی درجن بھر ماہی‌گیروں کے ساتھ شراب خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کے پیچھے ہی گداز جسموں اور گھنی گھنی بھوؤں والی کچھ عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں جو کبھی اپنے شوہروں کی آستینیں پکڑ کے کھینچتی تھیں اور کبھی کسی مرد کے شانے کے اوپر سے ہاتھ پھیلا کر وادکا کا گلاس اٹھا لیتی تھیں — بالکل فطری طور پر اپنے لئے۔ ان کی بانہوں کے پٹھے اتنے بڑے بڑے تھے جیسے کھرنجے کے پتھر۔ بھکاری نے جو دھتکارے جانے سے بےحد برہم تھا، اپنا قصہ چھیڑ رکھا تھا:

"...اور اس نے مجھے ذرا سی تمباکو تک نہ دی۔ «جب تم بالغ ہو جاؤگی» وہ کہتا ہے، «تو تمہارے لئے ایک شاندار سرخ جہاز یہاں آئےگا۔ وہ اس لئے کہ تمہارے مقدر میں ایک شہزادے سے شادی کرنا لکھا ہے۔ اور» وہ کہتا ہے، «یاد رکھنا کہ اس جادوگر نے کیا کہا ہے۔» لیکن میں کہتا ہوں: «ارے اب اس لڑکی کو جگا بھی دو تاکہ تم اپنی تمباکو کی تھیلی نکال سکو۔» اور آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ کیا ہوا؟ اس نے مجھے بھگا دیا اور آدھے راستے تک تعاقب کرتا رہا۔"

"کیا؟ کون؟ ارے یہ کاہے کے بارے میں باتیں کر رہا ہے؟" عورتوں کی متجسس آوازوں نے پوچھا۔

ماہی‌گیروں نے اپنے سروں کو عورتوں کی طرف قدرے موڑ کر طنزیہ مسکراہٹوں کے ساتھ تفصیلات بتائیں:

"لونگرین اور اس کی بیٹی جانوروں کی طرح وحشی ہو گئے ہیں اور شاید دونوں کے دماغ میں بھی کچھ خلل ہو گیا ہے۔ اسی کے متعلق یہ آدمی باتیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی جادوگر لونگرین کے ہاں آیا تھا اور اب باپ بیٹی کو کسی شہزادے کا انتظار ہے — عورتو، ذرا خیال رکھنا، موقع ہاتھ سے نہ گنوا دینا! ہاں تو ان کا یہ شہزادہ کسی دوسرے ملک سے آئےگا اور اس کے جہاز کے بادبان ارغوانی ہوں‌گے!"

تین دن بعد اسول شہر کی کھلونوں کی دوکان سے واپس لوٹ رہی تھی تو اس نے پہلی بار طعنے سنے:

"ارے اے پھانسی پانے لائق لڑکی! اے اسول! ذرا ادھر دیکھ! ارغوانی بادبان آ رہے ہیں!"

لڑکی چونک پڑی اور غیر ارادی طور پر آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا بنا کر سمندر کی طرف تکنے لگی۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کے ادھر دیکھا جدھر سے چیخیں سنائی دی تھیں۔ کوئی بیس فیٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے کچھ بچے منھ بنا بنا کے اسے اپنی زبانیں دکھا رہے تھے۔ لڑکی نے ٹھنڈی سانس بھری اور جلدی جلدی اپنے گھر کی طرف چل دی۔

۲

گرے

اگر سیزر کا خیال تھا کہ روم میں دوم ہونے سے تو کسی گاؤں ہی میں اول ہونا بہتر ہے تو آرتھر گرے کو سیزر سے جہاں تک کہ اس کی اس دانش‌مندانہ خواہش کا تعلق تھا، رشک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ گرے تو کپتان پیدا ہوا تھا، بننا چاھتا تھا اور بن گیا۔

گرے ایک جاگیر کی جس بڑی عمارت میں پیدا ہوا تھا وہ اندر سے بےرونق اور باھر سے عظیم الشان تھی۔ اس کے سامنے کے رخ پر پھولوں کے چمن اور پارک کا ایک حصہ واقع تھے۔ یہاں لالے کی بہترین اقسام کے چمکدار نیلے، ارغوانی اور گلابی مائل سیاہ پھول لاپروائی سے بکھیر دئے جانے والے دانوں کی لڑیوں کی طرح چاروں طرف بہار دکھاتے رہتے تھے۔ پارک کے بوڑھے درخت لہراتی، بل کھاتی ندی کے کنارے سیج کے پودوں کے اوپر دھندلی دھندلی فضا میں اونگھتے رہتے تھے۔ محل کا جنگلا کیونکہ یہ عمارت دراصل ایک محل ہی کی تھی، ڈھلے ہوئے لوھے کے اوپر کی طرف چکر کھاتے ستونوں پر مشتمل تھا جن کے درمیانی حصوں میں آھنی جالیاں جڑی ہوئی تھیں۔ ھر ستون کے اوپر لالے کا ایک آھنی پھول بنا ہوا تھا۔ مختلف تقریبات کے موقعے پر ان پھولوں کے پیالوں میں تیل بھر دیا جاتا تھا اور یہ رات کے سینے میں دور تک پھیلی ہوئی آتشیں قطار کی طرح جلتے رہتے تھے۔

گرے کے والدین اپنے معاشرتی مرتبے، دولت اور اس معاشرے کے متکبر غلام تھے جس کا تذکرہ وہ "ہم" کہہ کر کیا کرتے تھے۔ ان کی روحوں کا جو حصہ ان کے آبا و اجداد کی گیلری پر مرکوز تھا وہ واقعی اس لائق نہیں کہ اس کا تذکرہ کیا جائے جبکہ دوسرا حصہ — گیلری کا ایک خیالی تسلسل — ننھے گرے سے شروع ہوا جس کی قسمت میں اس انداز سے زندگی بسر کرنا اور موت سے ہم‌کنار ہونا لکھا تھا کہ اس کے پورٹریٹ کا دیوار پر آویزاں کیا جانا خاندانی آن بان کے منافی نہ ہوتا۔ تاھم اس منصوبے میں ایک چھوٹی سی غلطی رہ گئی تھی: آرتھر گرے پرجوش دل لے کے دنیا میں آیا تھا اور وہ خاندانی تاریخ کے سلسلے کو جاری رکھنے کی طرف ذرا بھی مائل نہ تھا۔

لڑکے کی یہ زندہ دلی، یہ مکمل بےتعصبی اسی وقت انتہائی نمایاں طور پر سامنے آ گئی جب وہ اپنی عمر کے آٹھویں سال میں تھا۔ عجیب و غریب خیالات سے متاثر بانکوں جیسے فرد کی، کسی متلاشی اور معجزے دکھانے والے فرد کی جس نے اپنے لئے زندگی کے بےشمار کرداروں میں سب سے پرخطر اور پراثر کردار — خدا کا کردار — منتخب کیا ہو، گرے کی شخصیت میں جھلک اسی لمحے سے نظر آنے لگی

جب اس نے ایک کرسی دیوار کے قریب رکھی، اس پر چڑھ کے حضرت عیسی کے مصلوب کئے جانے کی ایک تصویر تک پہنچا اور ان کے خون‌آلود ھاتھوں کے ناخن غائب کر دئے یعنی ان پر نیلا رنگ پھیر دیا جسے وہ گھروں کی پتائی کرنے والے کے ھاں سے چرا لایا تھا۔ تصویر اس تبدیلی کے ساتھ اسے زیادہ قابل برداشت معلوم ہوئی۔ وہ اپنے اس عجیب کام کی رو میں کچھ اتنا بہہ گیا کہ اس نے حضرت عیسی کے پیروں پر بھی رنگ پھیرنا شروع کر دیا لیکن اس کے باپ نے اسے متحیر کر دیا۔ بوڑھے نے لڑکے کے کان کھینچ کر اسے کرسی سے نیچے اتار دیا اور پوچھا:

"آخر تم نے یہ تصویر کیوں بگاڑ دی؟"

"میں نے اسے بگاڑا تو نہیں۔"

"یہ ایک مشہور مصور کا شاھکار ھے۔"

"مجھے اس کی خاک بھی پروا نہیں۔ میں ھرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ کسی کے ھاتھوں کے ناخن اکھاڑے جائیں اور ان سے خون بہے۔ میں نہیں چاھتا کہ ایسا ھو۔"

لیونیل گرے نے اپنی مسکراھٹ کو مونچھوں میں چھپاتے ہوئے بیٹے کے جواب میں خود اپنے آپ کو پہچان لیا اور اسے سزا نہ دی۔

گرے بڑی لگن کے ساتھ محل کے کونے کونے کو چھانتا رھتا تھا اور اس کی دریافتیں حیرت انگیز ھوتی تھیں۔ اسے سب سے اوپری منزل کے کھپریلی چھت والے کمرے میں کسی بانکے کی زنگ آلود زرہ، آھنی اور چرمی جلدوں والی کتابیں، پادریوں کے بوسیدہ چوغے اور کبوتروں کے جھنڈ ملے۔ تہ خانے میں جہاں شرابیں رکھی جاتی تھیں، اس نے لافیت، ماڈیرا اور شیری کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل کیں۔ یہاں پتھر کی محرابی چھتوں کے ترچھے مثلثوں میں پھنسی ہوئی پیکان نما کھڑکیوں کی دھندلی دھندلی روشنی میں چھوٹے بڑے چوبی پیپے رکھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑا، چپٹے دائرے کی شکل کا پیپا تہ‌خانے کی ساری چھوٹی دیوار کو گھیرے ہوئے تھا اور اس کی شاہ بلوط کی سو سال پرانی سیاہ لکڑی کسی عمدگی سے پالش کی ہوئی لکڑی کی طرح چمچما رھی تھی۔ پیپوں کے درمیان کشادہ شکم، سبز اور گہری نیلی بوتلیں بید کی ٹوکریوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ پتھروں اور کچے فرش پر بھوری بھوری سانپ چھتریاں کمزور ڈنٹھلوں پر اگی ہوئی تھیں۔ سارے ماحول پر پھپوندی، کائی، نمی اور دم گھونٹنے والی تلخ بو کی حکمرانی تھی۔ شام کو آفتاب کی آخری کرنیں تہ خانے کے ایک الگ تھلگ گوشے تک پہنچتی تھیں تو وھاں مکڑیوں کا ایک زبردست جالا سونے کی طرح چمک اٹھتا تھا۔ کروم‌ویل کے زمانے کی بہترین ایلی‌کانٹ شراب کے دو پیپے ایک جگہ زمین میں گڑے ہوئے تھے اور تہ خانے کا نگراں گرے کو اشارے سے ایک خالی گوشہ دکھاتا اور اس مشہور قبر کا قصہ بیان کرنے کے موقعے کو ھاتھ سے نہ جانے دیتا جس میں لومڑی کا شکار کرنے والے چھوٹے کتوں سے

بھی زیادہ جوشیلا مردہ دفن تھا۔ وہ اپنا قصہ شروع کرتا تو بڑے پیپے کی ڈاٹ کی جانچ کرنا کبھی نہ بھولتا جس کے بعد وہ اس کے پاس سے نمایاں اطمینان کے ساتھ ہٹ آتا کیونکہ اس کی دفعتاً مسرور ہو جانے والی آنکھوں میں انتہائی تند و تیز خوشی کے غیر معمولی آنسو چمک اٹھتے تھے۔

"اچھا تو" پولڈیشوک کسی خالی ٹوکرے پر بیٹھ کر اپنی نکیلی ناک میں چٹکی بھر نسوار رکھتے ہوئے گرے سے کہتا، "آپ وہ جگہ دیکھ رہے ہیں نا؟ وہاں ایسی شاندار شراب گڑی ہوئی ہے کہ اس کا ایک چھوٹا سا بھی گلاس حلق کے نیچے اتارنے کی خاطر بہت سے شرابی اپنی زبان تک کٹوانے پر راضی ہو جائیں گے۔ ہر پیپے میں اس مادے کا سو سو لیٹر بھرا ہوا ہے جس سے روح میں دھماکا ہوتا اور جسم گندھے ہوئے آٹے کا گولا بن جاتا ہے۔ یہ چیری سے زیادہ سیاہ ہے اور اسے بوتل سے انڈیلا نہیں جا سکتا۔ بالکل ملائی جیسی گاڑھی ہے یہ شراب۔ شاہ بلوط کی سیاہ لکڑی جو لوہے جیسی مضبوط ہوتی ہے اسی کے پیپوں میں بند ہے یہ۔ پیپوں کے اوپر تانبے کے دو دو حلقے ساتھ ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ ان حلقوں پر لاطینی حروف میں یہ عبارت درج ہے: «مجھے گرے جنت میں پئے گا۔» اس کے مفہوم میں اتنا زیادہ اختلاف رائے تھا کہ آپ کے پردادا سیمون گرے نے دیہات میں ایک شاندار عمارت تعمیر کرا کے اس کا نام "جنت" رکھا اور سوچا کہ اس طرح ایک بےضرر مذاق کے ذریعے وہ پراسرار عبارت اور حقیقت کو ہم‌آہنگ کر دیں گے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوا؟ پیپے کے اوپر سے ابتدائی حلقے جیسے ہی الگ کئے گئے ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ دنیا سے کوچ کر گئے۔ اتنا ہی زیادہ تھا شرابوں کے اس بوڑھے رسیا کا جوش و خروش۔ اس کے بعد سے تو صاحبزادے، اس پیپے کو کسی نے چھوا تک نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بیش‌بہا شراب تباہی لے آئے گی۔ واقعی ایسی پہیلی تو داستانی دیونی بھی نہیں بجھاتی تھی۔ سچ ہے کہ اس نے ایک دانا سے ضرور یہ پوچھا تھا: «کیا میں تمہیں دوسروں ہی کی طرح کھا جاؤں گی؟ مجھے صحیح صحیح جواب دو اور تمہاری جان بچ جائے گی» لیکن ذرا انہماک سے سوچنے کے بعد..."

"میرا خیال ہے کہ ڈاٹ پھر رسنے لگی" پولڈیشوک اپنے قصے کو روک کر کہتا اور ترچھا ہو کے کونے کا رخ کرتا۔ ڈاٹ کو کس دینے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ واپس لوٹتا۔ "ہاں۔ کچھ غور و خوض کے بعد اور اہم‌ترین بات یہ کہ سوچنے میں کچھ وقت لگا کر وہ دانا اس دیونی کو جواب دے سکتا تھا: «ہمیں چل کے کچھ پینی چاہئے جس کے بعد تمہیں ایسی مہمل باتوں کا ہوش ہی نہ رہے گا۔» «مجھے گرے جنت میں پئے گا!» آخر اس سے کوئی کیا مطلب نکالے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے مرنے کے بعد پئے گا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کوئی ولی ہے اور ولی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ھلکی یا تیز کوئی بھی شراب نہیں پیتا۔ اچھا، فرض کئے لیتے ہیں کہ «جنت» کا مطلب مسرت سے

ہے۔ لیکن سوال اس انداز سے کیا جائے تو کوئی بھی مسرت اپنی آدھی چمک دمک کھو بیٹھے جبکہ مسرور شخص اپنے آپ سے خلوص کے ساتھ پوچھےگا: کیا یہ جنت ہے؟ تو یہ ہے ساری دشواری۔ اس پیپے کی شراب کو اطمینان کے ساتھ اور ہنستے ہوئے، ہاں میرے بیٹے، صحیح معنوں میں ہنستے ہوئے پینے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کا ایک پیر زمین پر ہو اور دوسرا آسمان میں۔ ایک تیسرا نظریہ بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک روز کوئی گرے نشے میں بری طرح دھت ہو جائےگا اور وہ اس پیپے کو بالکل ہی خالی کر دےگا۔ تاہم میرے بیٹے، ایسا کرنے کا مطلب پیشین گوئی پر عمل درآمد نہ ہوگا، یہ تو محض شراب خانے کی دھینگا مشتی ہوگی۔"

بڑے پیپے کی ڈاٹ کے ٹھیک سے بند ہونے کی ایک بار پھر جانچ کرنے کے بعد پولڈیشوک نے اپنے چہرے سے سنجیدگی اور انہماک کا تاثر دیتے ہوئے قصے کو یوں انجام تک پہنچایا:

"آپ کے جد اعلا جان گرے ان پیپوں کو لزبن سے ۱۷۹۳ء میں جہاز "بیگل" پر لائے تھے۔ شراب کے لئے انہوں نے دو ہزار طلائی پیاسٹر ادا کئے تھے۔ پانڈیچری کے بندوق ساز بنجامین الیان نے پیپوں پر یہ عبارت کندہ کی تھی۔ یہ زمین میں چھ فیٹ کی گہرائی پر انگور کی بیلوں کی راکھ سے ڈھکے ہوئے گڑے ہیں۔ اس شراب کو کبھی کسی نے پینا تو درکنار چکھا تک نہیں اور کبھی کوئی پی بھی نہ سکےگا۔"

"میں تو اسے پیوں‌گا" گرے نے ایک روز زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

"کتنے بہادر نوجوان ہیں آپ!" پولڈیشوک نے کہا۔ "اور آپ اسے جنت میں پئیں گے؟"

"بےشک! یہ رہی جنت! یہاں ہے، دیکھا آپ نے؟" گرے نے دھیرے سے ہنستے ہوئے اپنی چھوٹی سی مٹھی کھول دی۔ اس کی نازک لیکن عمدہ ساخت کی ہتھیلی دھوپ سے چمک اٹھی جس کے بعد اس نے دوبارہ مٹھی بند کر لی۔ "یہ رہی جنت! ابھی اس کے اندر ہے ابھی غائب ہو گئی!"

یہ کہتے وقت وہ اپنی مٹھی کو بند کرتا اور کھولتا رہا۔ آخرکار وہ اپنے اس مذاق سے خوش ہو کے پولڈیشوک کے آگے آگے دوڑتا ہوا پہلی منزل کی گزرگاہ کو جانے والے تاریک زینے پر پہنچ گیا۔

گرے کے لئے باورچی خانے میں قدم رکھنا قطعاً ممنوع تھا لیکن لو دیتے ہوئے چولھوں اور کالک، ابلتے ہوئے رقیق کھانوں کی پھنکاروں اور بلبلوں، چاقوؤں کے مختلف چیزوں کو کاٹنے کی آوازوں اور منہ میں پانی لانے والی خوشبوؤں کی اس شاندار دنیا کو ایک بار دریافت کر لینے کے بعد وہ اس کشادہ کمرے میں پابندی کے ساتھ آنے جانے لگا۔ رکاب دار بتوں جیسی خاموشی کے ساتھ بڑے پادریوں کی طرح ادھر ادھر چلتے پھرتے تھے اور دھوئیں سے سیاہ ہو جانے والی دیواروں کے پس منظر میں ان کی اجلی اجلی ٹوپیاں ان کی حرکات کو مقدس رسوم کی سی حیثیت دے

دیتی تھیں۔ برتن دھونے والے فربہ اندام اور زندہ دل افراد پانی کے پیپوں کے پاس کھانے کے برتنوں کو رگڑ رگڑ کے صاف کرتے تھے اور چینی اور چاندی کی جھنکار ابھرتی رہتی تھی۔ لڑکے عام مچھلیوں، کستورا اور جھینگا مچھلیوں اور پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں اٹھائے، وزن سے جھکے ہوئے اندر داخل ہوتے تھے۔ لمبی میز پر رنگ برنگے تیتر، بھوری بطخیں اور چمکدار پروں والی مرغیاں رکھی ہوئی تھیں، کچھ دوری پر ننھی سی دم والے سور کے دودھ پیتے بچے کی لاش پڑی ہوتی تھی جس کی آنکھیں کسی چھوٹے بچے کی آنکھوں کی طرح بند ہوتی تھیں۔ شلجم، کرم کلے، اخروٹ، منقے اور دھوپ کے چمکائے ہوئے شفتالو بھی ڈھیر ہوتے تھے۔

گرے باورچی‌خانے میں ہمیشہ ہی کچھ گھبرایا سا، سہما سا رہتا تھا۔ اس کو لگتا تھا کہ یہاں کسی عجیب و غریب شے کی حکمرانی ہے جس کی قوت محل کی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ بلند آوازیں اسے احکام اور دعا جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ باورچی‌خانے کے عملے کی حرکات میں برسوں کے تجربے سے ایسی نپی تلی مہارت اور موسیقیت پیدا ہو گئی تھی جو الہام سی لگتی تھی۔ گرے کا قد ابھی اتنا اونچا نہیں ہوا تھا کہ وہ سب سے بڑے کڑاہ میں جھانک کے دیکھ سکتا لیکن وہ اس کا خاص طور سے احترام کرتا تھا۔ دو خادمائیں اسے اتارنے لگتیں تو وہ سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھنے لگتا۔ ایسے موقعوں پر کڑاہ سے کچھ جھاگ چھلک کے آتش‌دان پر گرتا اور اس کے سنسناتے ہوئے ڈھکن سے بھاپ کی لہر اٹھ کے باورچی خانے میں پھیل جاتی۔ ایک بار زیادہ جھاگ چھلک پڑنے سے ایک خادمہ کا ہاتھ جھلس گیا، جلد فوراً ہی سرخ پڑ گئی اور بیٹسی (اس کا نام یہی تھا) جلی ہوئی جگہوں پر تیل لگاتے وقت رو پڑی۔ اس کے گول گول، خوف‌زدہ چہرے پر آنسو ناقابل ضبط طور پر بہنے لگے۔

گرے خوف کی شدت سے بت بن کے رہ گیا۔ دوسری عورتیں بیٹسی کے پاس اکٹھا ہو گئیں تو گرے دوسرے شخص کی تکلیف کے احساس سے جس کا وہ خود تجربہ نہیں کر سکتا تھا، اچانک تڑپ اٹھا۔

"کیا بہت زیادہ درد ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آپ خود آزما لیجئے نا، ابھی ابھی معلوم ہو جائے‌گا" بیٹسی نے اپنے ہاتھ کو اپرن سے ڈھکتے ہوئے جواب دیا۔

لڑکے کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے اسٹول پر کھڑے ہو کے لمبے دستے کا چمچ کھولتے ہوئے دیگچے میں (اس میں میمنے کا گوشت پک رہا تھا) ڈالا اور کچھ شوربا اپنی کلائی پر گرا لیا۔ جلد پر محسوس ہونے والی فوری سنسنی زیادہ ناگوار نہ تھی لیکن شدید درد سے پیدا ہونے والے اضمحلال سے وہ اسٹول پر جھوم سا گیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو پتلون کی جیب میں چھپائے ہوئے آٹے جیسے زرد چہرے کے ساتھ بیٹسی کے پاس گیا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ تم سخت تکلیف میں مبتلا ہو" اس نے دھیرے سے کہا لیکن خود اپنے تجربے کا ذکر نہ کیا۔ "ڈاکٹر کے پاس چلو، بیٹسی۔ آؤ چلو!"

وہ خادمہ کے سائے کو پکڑ کے متواتر کھینچتا رہا حالانکہ اس دوران گھریلو دواؤں میں یقین رکھنے والے لوگ بیٹسی کو بھانت بھانت کے مشورے دئے جا رہے تھے۔ بہرحال درد چونکہ بہت شدید تھا اس لئے وہ گرے کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ڈاکٹر نے جلی ہوئی جگہ پر کوئی دوا لگا کے اسے درد سے نجات دلا دی۔ بیٹسی چلی گئی تب کہیں جا کر گرے نے ڈاکٹر کو خود اپنا ہاتھ دکھایا۔

اس معمولی سے واقعے کی بدولت بیس سالہ بیٹسی اور دس سالہ گرے میں گہری دوستی قائم ہو گئی۔ خادمہ اس کی جیبیں مٹھائیوں اور سیبوں سے بھر دیا کرتی تھی اور گرے اسے پریوں کی کہانیاں اور دوسرے قصے سناتا جو اس نے اپنی کتابوں میں پڑھے تھے۔ ایک روز اسے پتا چلا کہ بیٹسی اپنے منگیتر سائیس جیم سے شادی نہیں کر پا رہی ہے کیونکہ مفلسی کی بنا پر ساتھ رہنے کے لئے خود اپنے گھر کا انتظام کرنا ممکن نہ تھا۔ گرے نے آتشدان کی آگ کریدنے کی سلاخوں کی مدد سے سور کے بچے کی شکل کے اپنے چینی کے گولک میں شگاف کر دیا اور اسے ہلا ہلا کر ساری جمع کی ہوئی پونجی باہر نکالی جو تقریباً سو پونڈ تھی۔ صبح کو وہ جلد ہی بیدار ہو گیا اور غریب لڑکی باورچی خانے میں چلی گئی تو چپکے سے اس کے کمرے میں داخل ہو کے یہ رقم اس کے صندوقچے میں رکھ دی۔ اس کے اوپر ایک پرچہ رکھ دیا جس پر لکھا تھا: "بیٹسی، یہ تمہارے لئے ہے۔ رابن ہڈ۔" باورچی خانے میں اس واقعے سے ایسی ہلچل سی مچ گئی کہ گرے کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ رقم اسی نے رکھی ہے۔ لیکن اس نے رقم واپس نہ لی اور اس کے متعلق مزید ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ ہوا۔

گرے کی ماں ان افراد میں سے ایک تھی جنہیں زندگی بنے بنائے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ وہ خوش حالی کی ایسی خوبصورت دنیا میں رہتی جہاں عیش و عشرت کی تمام سہولیات میسر تھیں اس لئے اپنے درزیوں، ڈاکٹر اور بٹلر سے صلاح مشورہ کرنے کے سوا اس کی اور کوئی مصروفیت نہ تھی۔ تاہم، فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس کا اپنے عجیب و غریب بیٹے سے انتہائی پرجوش اور تقریباً مذہبی اعتقاد جیسا گہرا لگاؤ ہی اس کے ان میلانات کا واحد اظہار تھاجنہیں اس کی تربیت اور خوش اقبالی نے بےہوش کر دیا تھا، جو اب پوری طرح زندہ نہ تھے بلکہ دھیرے دھیرے سسک رہے تھے اور اس طرح اس کی قوت ارادی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ عالی نسب خاتون اس مورنی سے مشابہ تھی جس نے سارس کے انڈے سے بچہ نکالا ہو۔ وہ اپنے بیٹے کی شاندار یکتائی کے احساس سے لرز اٹھتی تھی، اسے کلیجے سے لگاتی تھی تو اس کا سارا وجود اداسی، محبت اور ضبط سے معمور ہو جاتا تھا اور اس کا دل اس کی عادتاً محض روایتی قسم کے رشتوں اور خیالات کا اظہار کرنے والی

زبان سے مختلف انداز میں باتیں کرنے لگتا تھا۔ یہ ایسی ہی صورت حال تھی جیسے بادلوں کا عکس جسے آفتاب کی شعاعوں نے بگاڑ کے ہیبت ناک کر دیا ہو، کسی متناسب حصوں والی پبلک عمارت کے اندر داخل ہوتا اور اسے اس کی معمولی خوبیوں سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے لیکن ایوان کو پہچان نہیں پاتی، بےرونق ماحول کے درمیان روشنی کے پراسرار جلوے چوندھیا دینے والی ہمآہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ عالی نسب خاتون جس کا چہرہ اور جسم ایسا لگتا تھا کہ زندگی کی آتشیں آوازوں پر صرف سرد مہری کی خاموشی سے ہی رد عمل ظاہر کر سکتے تھے اور جس کا حسن و جمال کشش سے زیادہ کراہت کا باعث ہوتا تھا کیونکہ لوگ اس کے تکبر اور تصنع کو بھانپ لیتے تھے ـ یہی لیلین گرے جب اپنے بیٹے کے ساتھ تنہا ہوتی تھی تو سیدھی سادی ماں میں بدل جاتی تھی اور نرم محبت بھرے لہجے میں پیار کی ایسی ایسی باتیں کرتی تھی جنہیں قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان الفاظ کی قوت تو ان کے معنوں میں نہیں بلکہ جذبات میں مضمر ہوتی ہے۔ بیٹے کی خواہشات کو خواہ وہ کیسی بھی کیوں نہ ہوتی ہوں، پورا کرنے سے انکار کر دینا اس کے بس میں نہ تھا۔ وہ گرے کے باورچی خانے کے چکر لگانے، اپنے سبقوں سے نفرت کرنے، کہنا نہ ماننے اور اس کی بہت سی الٹی سیدھی حرکتوں ـ سب کو درگزر کر دیتی تھی۔

اگر وہ نہیں چاھتا تھا کہ درختوں کی ٹہنیاں کاٹ چھانٹ کے انہیں سنوارا جائے تو کوئی درختوں میں ھاتھ بھی نہیں لگاتا تھا، اگر وہ کہہ دیتا تھا کہ کسی شخص کو معاف کر دیا جائے یا انعام دیا جائے تو متعلقہ شخص یقین کر لیتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ جس گھوڑے پر چاھتا سواری کرتا، جس کتے کو چاھتا محل کے اندر لے آتا، لائبریری میں کتابوں کا مطالعہ کرتا، ادھر ادھر ننگے پیر دوڑتا پھرتا اور جو جی میں آتا کھا لیتا۔

اس کے باپ نے ان سب باتوں پر روک لگانے کی کوشش کی لیکن اسے آخرکار اپنی شکست تسلیم کرنی پڑی ـ اصولوں کے سامنے نہیں بلکہ اپنی بیوی کی مرضی کے سامنے۔ نوکروں کے سب بچوں کو البتہ اس نے محل سے باھر منتقل کرا دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ بیٹا "رذیلوں" کی صحبت میں پڑ گیا تو اس کی الٹی سیدھی حرکات میلانات کی شکل اختیار کر لیں گی جنہیں آسانی سے ختم نہ کیا جا سکےگا۔ ویسے بھی اس کا سارا وقت ان خاندانی مقدمے بازیوں کی نذر ہو جاتا تھا جن کا آغاز پہلی کاغذ ملوں کے قیام کے دور ہی میں ہو گیا تھا اور اختتام شاید آخری بہتان تراش کی موت ہی سے ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی مصروفیات تھیں مثلاً ریاستی امور، خود اپنی جاگیر کی دیکھ بھال، اپنی یاد داشتوں کو بول بول کے لکھوانا، شاندار شکاروں کا اہتمام، اخبارات کا مطالعہ اور طویل خط و کتابت جس کا مقصد خود کو

خاندان کے باقی لوگوں سے ذہنی طور پر کچھ الگ تھلگ رکھنا تھا۔ بیٹے کو دیکھنے کی نوبت اتنی کم آتی تھی کہ کبھی کبھی تو وہ اس کی عمر تک بھول جاتا تھا۔

اس طرح گرے خود اپنی ھی دنیا میں مگن رہتا تھا۔ وہ تنہا عموماً محل کے عقبی احاطوں میں کھیلتا رھتا تھا جو کبھی قدیم زمانے میں حفاظتی ضروریات کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ ان وسیع و عریض قطعات آراضی پر جہاں گھری گھری خندقوں اور کائی سے ڈھکے ھوئے پتھروں کے تہہ خانوں کے کھنڈر موجود تھے، طرح طرح کے خودرو پودوں مثلاً بچھوا، برائر اور بلیک‌تھارن کی جھاڑیوں اور چمکدار جنگلی پھولوں کے پودوں کی بھرمار تھی۔ گرے اس علاقے میں کئی کئی گھنٹے گزار دیتا اور کبھی چھچھوندروں کے بلوں کی چھان‌بین کرتا، کبھی خودرو پودوں سے الجھتا، کبھی تتلیوں کا تعاقب کرتا اور کبھی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے "قلعے" بنا بنا کر ان پر ڈنڈوں اور پتھروں سے گولاباری کرتا۔

وہ بارہ سال کا ہو رہا تھا تب اس کی روح کی تمام پیچیدگیوں، تمام الگ الگ رجحانات اور خفیہ تحریکات نے واحد طاقتور لہر کی شکل اختیار کر لی اور یہ سب اپنے اس ہم‌آہنگ اظہار کے بعد ایک دبائی نہ جا سکنے والی خواہش بن گئے۔ اس وقت تک ایسا لگتا تھا کہ گرے خود اپنے باغ کے مختلف‌النوع حصے ھی — دھوپ میں نہائی ہوئی کوئی جگہ، کوئی چھاؤں، کوئی پھول، کسی زبردست درخت کا سیاہ تنا — بہت سے دوسرے باغوں میں دریافت کر سکا تھا لیکن اب اس نے اچانک ان سب کو جن میں بڑی شاندار اور حیرت انگیز ہم آھنگی پائی جاتی تھی، ایک ھی جگہ صاف صاف دیکھ لیا۔

یہ واقعہ لائبریری میں پیش آیا۔ بلند دروازہ جس کے اوپر پنکھے کی شکل کی دھندلی سی کھڑکی واقع تھی، عموماً مقفل رھتا تھا لیکن بیلن اپنے خانے میں پوری طرح کستا نہیں بلکہ ڈھیلا پڑتا تھا اس لئے دروازے کو زور سے دھکا دیا جاتا تھا تو وہ بیلن کے باھر نکل آنے کی وجہ سے کھل جاتا تھا۔ گرے کو مہم‌جوئی کے جذبے نے لائبریری کے اندر داخل ھونے پر اکسایا تو وہ وھاں خاکستری روشنی کو جس میں سیسے کے چوکھٹے والی کھڑکی کے شیشوں پر بنے ھوئے رنگین نقش و نگار نے انوکھی کیفیت پیدا کر دی تھی، دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ لائبریری کے استعمال نہ کئے جانے کی وجہ سے سارے ماحول پر تالاب کے ٹھہرے ھوئے پانی جیسا سکوت طاری تھا۔ کہیں کہیں کتابوں کی الماریوں کی سیاہ قطاریں کھڑکیوں سے اس طرح مل گئی تھیں کہ ان کے نصف حصوں کو ڈھک لیا تھا۔ الماریوں کے درمیانی راستوں پر بھی کتابوں کے ڈھیر لگے ھوئے تھے۔ ایک جگہ ایک کھلا ھوا البم رکھا تھا جس کے وسطی اوراق پھسل کے نیچے گر گئے تھے۔ ایک اور جگہ کچھ خطوط سنہری ڈوری سے بندھے ھوئے رکھے تھے، کالی کالی سی کتابیں ڈھیر تھیں، قلمی نسخوں کی موٹی موٹی تہیں جمی ھوئی تھیں اور ننھی ننھی کتابوں کے انبار لگے تھے جو کھولنے پر چھال کی طرح

چرمراتی تھیں۔ یہاں خاکے، نقشے اور کتابوں کے نئے اڈیشنوں کی قطاریں بھی موجود تھیں۔ اور کتابوں کی جلدوں کا تو کہنا ھی کیا ـ بھدی، نفیس، سیاہ، رنگ برنگی بندکیوں والی، نیلی، بھوری، دبیز اور پتلی، کھردری اور چکنی بھانت بھانت کی جلدیں نظر آتی تھیں۔ کتابوں سے پوری طرح بھری ہوئی الماریاں ایسی دیواروں جیسی معلوم ہو رہی تھیں جنھوں نے اپنے اندر خود زندگی ھی کو اسیر کر لیا ہو۔ الماریوں کے شیشوں پر بےرنگ، ٹمٹماتے ہوئے دھبوں سے ڈھکی دوسری الماریوں کے عکس پڑ رہے تھے۔ ایک گول میز پر بہت بڑا گلوب خط استوا اور نصف النہار سے بنتے ہوئے تانبے کے کرہ نما کراس کے درمیان رکھا ہوا تھا۔

گرے باھر جانے کے دروازے کی طرف مڑا تو اسے دروازے سے کچھ بلندی پر ایک بہت بڑی سی تصویر آویزاں نظر آئی جس کی شبیہوں نے فوراً ھی لائبریری کی گھری خاموشی کو بھر دیا۔ یہ ایک زبردست لہر کی چوٹی پر ابھرتے ہوئے کسی جہاز کی تصویر تھی جس کے پہلوؤں سے جھاگ بہہ کے نیچے آ رہا تھا۔ جہاز کو ٹھیک اس حالت میں پیش کیا گیا تھا جو اس کے پانی پر ابھرنے کے بالکل آخری لمحے میں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جہاز تصویر کو دیکھنے والے کی طرف سیدھا تیرتا چلا آ رہا ہے۔ جہاز کے آگے کی طرف نکلی رہنے والی مخروطی بلی اوپر اٹھ گئی تھی جس کی وجہ سے مستولوں کے نچلے حصے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ زبردست لہر کی چوٹی کو جہاز کے پیندے نے بیچ سے پھاڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ کسی بہت بڑے طائر کے بازووں سے مشابہت اختیار کر گئی تھی۔ جھاگ فضا میں اڑ رہا تھا۔ اگلے حصے کے بلند عرشے کے پیچھے اور مخروطی بلی کے اوپر بمشکل ھی نظر آتے ہوئے بڑے بڑے بادبان جو طوفان کی تندی و تیزی سے پھول گئے تھے، دشوار صورت حال کو صبر سے جھیل رہے تھے تاکہ لہر کی چوٹی سے آگے بڑھ کے خود کو سیدھا کر لیں اور پھر خلا میں جھک کر جہاز کو نئی لہروں کی طرف بڑھا سکیں۔ سمندر پر نیچے نیچے، ایک دوسرے سے الجھے ہوئے بادل منڈلا رہے تھے۔ دھندلی دھندلی روشنی رات کی لمحہ بہ لمحہ قریب تر آتی ہوئی تاریکی سے بےسود جد و جہد میں مصروف تھی۔ تاھم تصویر کا سب سے زیادہ جاذب توجہ پہلو وہ آدمی تھا جو دیکھنے والے کی طرف پیٹھ کئے جہاز کے اگلے بلند عرشے پر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر صورت حال حتی کہ لمحے کی نوعیت تک کا پوری طرح احساس ہو جاتا تھا۔ اس شخص کے کھڑے ہونے کے انداز سے (دونوں پاؤں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر رکھے ہوئے تھے اور ھاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے) تو قطعاً واضح نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن قیاس لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے عرشے کی ایسی کسی چیز پر اپنی ساری توجہ مبذول کر رکھی ہے جو دیکھنے والے کی نظروں سے اوجھل تھی۔ تیز ہواؤں نے اس کے کوٹ کے دامن کو پیچھے کی طرف موڑ رکھا تھا، اس کے بالوں کی سفید چوٹی اور سیاہ تلوار فضا میں معلق سی تھیں۔ وہ اپنے عمدہ کپڑوں کی بنا پر کپتان معلوم ہو

رہا تھا، اس کے رقص کرنے کے سے انداز میں لہروں کی سبک رفتاری کا احساس ہوتا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ برہنہ سر شخص خطرناک صورت حال سے نپٹنے میں پوری طرح مصروف ہے اور چیخ چیخ کے کچھ کہہ رہا ہے ۔ مگر کیا؟ کیا اس نے کسی شخص کو پانی میں گرتے دیکھا تھا، کیا وہ جہاز کا رخ پھیرے جانے کا حکم دے رہا تھا یا پھر بڑے ملاح کو زور زور سے پکار رہا تھا؟ تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے گرے کے ذہن میں یہ خیالات نہیں بلکہ ان خیالوں کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ کوئی نا معلوم، غیر مرئی شخص بائیں جانب سے اس کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ادھر اس نے مڑ کے دیکھا اور ادھر اس پراسرار کیفیت کا یوں خاتمہ ہو جائےگا کہ پتا بھی نہ چلےگا۔ لیکن اس نے اپنے تخیل کی شمعیں نہ گل کیں اور انہی کی طرف متوجہ رہا۔ کسی بےصدا آواز نے چیخ کے چند سخت فقرے ادا کئے جو اس کے لئے یوں ناقابل فہم تھے جیسے ملاوی زبان کے ہوں؛ پھر برف کے تودے گرنے کی آوازیں ابھریں اور لائبریری کا ماحول گونجوں اور نہایت ہی عضبناک ہوا سے بھر گیا۔ گرے نے ان سب آوازوں کو اپنے وجود کے اندر سنا اور اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ دوسرے ہی لمحے بحال ہو جانے والے مکمل سکوت نے اس کی فنطاسیہ کے منڈلاتے ہوئے جالوں کو دور بھگا دیا اور طوفان سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

گرے تصویر کو دیکھنے کے لئے اور کئی بار لائبریری میں گیا اور یہ تخلیق روح اور زندگی کی باہمی گفتگو کے اس ضروری لفظ کی حیثیت اختیار کر گئی جس کے بغیر انسان کے لئے اپنی ذات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ عظیم سمندر لڑکے کے وجود کے اندر بتدریج اپنی جگہ بناتا جا رہا تھا۔ پھر جیسے جیسے وہ لائبریری میں ان کتابوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھتا گیا جن کے سنہرے دروازوں کے عقب میں سمندروں کی نیلگوں تابناکی دیکھی جا سکتی تھی، ویسے ویسے وہ سمندر کا عادی ہوتا گیا۔ یہاں جہاز اپنے دنبالوں سے پھوار اڑاتے ہوتے گزرتے تھے۔ کچھ جہاز اپنے بادبانوں اور مستولوں سے محروم ہو جاتے تھے، انہیں لہریں نگل لیتی تھیں اور وہ گہرائیوں میں اتر کے تہہ پر ٹھہر جاتے تھے جہاں تاریکی میں مچھلیوں کی آنکھیں چمکتی رہتی تھیں۔ دوسرے جہاز ساحلوں تک جانے والی بڑی بڑی لہروں میں پھنس جاتے جو انہیں چٹانوں سے بار بار ٹکراتی اور واپس لوٹتے وقت ان کے ڈھانچوں کو خطرناک حد تک جھنجوڑ دیتی تھیں۔ جہاز جس کے بادبان، مستول، رسے وغیرہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے اور جس کا عملہ اسے چھوڑ کے چلا جاتا تھا، طویل اذیت میں مبتلا رہتا یہاں تک کہ کوئی نیا طوفان آ کے اسے پاش پاش کر دیتا۔ ایسے بھی جہاز ہوتے تھے جو کسی حادثے کا شکار ہوئے بغیر ایک بندرگاہ پر سامان لادتے اور اسے لے جا کر دوسرے بندرگاہ پر اتار دیتے تھے۔ عملہ کسی شراب خانے کی میز کے پاس بیٹھ کے سمندری زندگی کے گن گاتا اور بڑے شوق سے مےنوشی کرتا۔ قزاقوں کے

جہاز بھی ہوتے تھے جن پر بحری قزاقوں کے سیاہ پرچم لہراتے رہتے تھے اور ان کا عملہ چھوٹے اور چوڑے پھل کی تلواریں لہراتے ہوئے بھیانک افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ جہازوں کے بھوت بھی ہوتے تھے جو نیلگوں روشنیوں کی موت جیسی بھیانک چمک رکھتے تھے۔ دوسری طرح کے بھی جہاز ہوتے تھے: سپاہیوں، توپوں اور بینڈ باجوں والے بحریہ کے جہاز، آتش فشاں پہاڑوں، مقامی حیوانات اور نباتات کا مطالعہ کرنے والی سائنسی مہموں کے جہاز، پراسرار قسم کے، عملے کی بغاوتوں سے متاثر ہونے والے جہاز، دریافتیں کرنے والے جہاز اور مہم جوئی کے جہاز۔

اس دنیا میں بالکل فطری طور پر اہم ترین شخصیت کپتان کی ہوتی تھی۔ وہ جہاز کا مقدر، روح اور دماغ ہوتا تھا۔ عملے کے کاموں اور تفریحات کا انحصار اسی کے کردار پر ہوتا تھا۔ وہ اپنے عملے کا انتخاب خود ھی کیا کرتا تھا جو کئی لحاظ سے اس کے مزاج و میلان کا آئینہ دار ہوتا تھا۔ وہ عملے کے ہر آدمی کی عادات اور خاندانی زندگی سے واقف ہوتا تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کے نزدیک ساحرانہ معلومات کا خزانہ ہوتا تھا جن کی بدولت وہ مثال کے طور پر لزبن سے شنگھائی تک کا طویل بحری راستہ بڑے اعتماد کے ساتھ متعین کر سکتا تھا۔ وہ کسی بھی طوفان کو پیچیدہ کوششوں کے نظام کے ذریعے اپنے جوابی اقدام سے پسپا اور اپنے سخت احکام سے عملے کی بدحواسی کو دور کر سکتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جہاز کو چلاتا یا ٹھہراتا تھا۔ جہاز کا سفر، سامان کی لدائی، مرمت اور آرام — سب کچھ اس کی ہدایات کے بموجب ھی ہوتا تھا۔ مسلسل حرکت و عمل والے کسی بھی اہم ادارے میں اس سے بڑے اور اس سے زیادہ ہوش مند حاکم کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ اس کے اختیارات کی جن میں کوئی دوسرا نہیں شریک ہوتا تھا اور جو مطلق العنانی کے آئینہ دار ہوتے تھے، طاقت آرفیس کی طاقت کی ہم‌پلہ تھی۔

کپتان کے اس تصور کو، اس خیالی شبیہ اور اس کے مرتبے کی اس حقیقت کو اس کی ذات سے وابستہ پرعزم واقعات کی بنا پر گرے کے شاندار تخیل میں ایک معزز مقام حاصل ہو گیا۔ اس پیشے کے سوا اور کوئی بھی پیشہ مختلف مسرتوں کے لطیف ترین پہلوؤں کو ان کی ساری انفرادیت کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے تمام خزانوں کو اتنی زیادہ کامیابی سے ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔ خطرہ، اندیشہ، قدرت کی قوتیں، کسی دور دراز سرزمین کی روشنیاں، حیرت انگیز نامعلوم، وصل اور جدائی سے پروان چڑھتی ہوئی پرجوش محبت، ملاقاتوں، چہروں اور واقعات کی مسحور کر دینے والی ہلچل؛ زندگی کا بےکراں تنوع جبکہ اوپر آسمان میں کبھی جنوبی کواکب جھلملاتے تھے اور کبھی دب اکبر اور تمام براعظم کپتان کی تیز نگاہوں کے سامنے ہوتے تھے حالانکہ اس کے کیبن میں اس کا وطن اپنی کتابوں، تصویروں، خطوط اور اس کے طاقتور سینے پر چمڑے کے لاکٹ کے اندر ریشم جیسے نرم بالوں کی لٹ میں لپٹے رکھے ہوئے خشک پھولوں کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتا تھا۔

اپنے پندرھویں سال کے موسم خزاں میں آرتھر گرے گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور سمندر کے سنہرے دروازوں سے ہو کر گزرا۔ کچھ ھی دنوں بعد جہاز "انسیلم" ڈوبیلٹ سے مارسیلز کے لئے روانہ ہوا تو اس کے عملے میں ایک لڑکا بھی شامل تھا جس کے چھوٹے چھوٹے ھاتھ اور چہرے کو دیکھ کر اس لڑکی کا خیال آتا تھا جس نے کسی لڑکے کے کپڑے پہن لئے ہوں۔ یہ لڑکا گرے ھی تھا، شاندار سفری تھیلے، دستانوں جیسے نفیس، بہترین چرمی جوتوں اور باریک عمدہ کپڑے کی قمیض کا مالک۔

سال بھر کے اندر ھی اندر جبکہ "انسیلم" فرانس، امریکا اور اسپین کا چکر لگاتا رھا، گرے کے پاس جو کچھ بھی تھا اس کا ایک حصہ اس نے پیسڑی کیکوں پر اڑا کر اپنے ماضی کو خراج تحسین پیش کیا اور باقی کو وہ حال و مستقبل کے نام پر تاش کھیل کھیل کر گنوا بیٹھا۔ دراصل وہ صحیح معنوں میں جوشیلا ملاح بننا چاھتا تھا۔ شراب پیتے وقت اس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا اور نہاتے وقت بارہ فیٹ کی بلندی سے غوطہ لگاتا تو اسے اپنے دل کی دھڑکن پل بھر کے لئے رکتی ہوئی سی محسوس ہوتی۔ دھیرے دھیرے اس نے سب کچھ کھو دیا سوائے اس چیز کے جو اھم ترین تھی ــ اس کی عجیب و غریب، بلندیوں کی طرف پرواز کرتی ہوئی روح۔ اس نے اپنی کمزوری کھو دی اور اس کی ھڈیاں چوڑی اور پٹھے طاقتور ہو گئے۔ چہرے کی زردی کی جگہ گہری سونلاھٹ نے لے لی۔ اس نے اپنی حرکات کی مہذب لاپروائی کھو کے اس کی جگہ مزدور کی تیزی اور مستعدی حاصل کر لی اور اس کی تیز آنکھوں میں الاؤ کو تکتے ہوئے شخص کی آنکھوں جیسی چنگاریاں تھرتھرانے لگیں۔ اور اس کی گفتگو اپنی ناھموار، دائمی طور پر شرمیلی روانی سے محروم ہو جانے کے بعد مختصر اور کسی مچھلی کی تھرتھراتی ہوئی چاندی پر بحری بگلے کی یلغار کی طرح درست اور تیز ہو گئی۔

جہاز "انسیلم" کا کپتان نیک دل لیکن سخت سمندر نورد تھا جس نے گرے کو محض نفرت کے جذبے کے تحت نوکری دی تھی۔ اس نے گرے کی شدید خواھش کو اس کے خبطی من‌موجی‌پن پر محمول کیا تھا اور یہ سوچ کر پہلے ھی سے بغلیں بجانے لگا تھا کہ دو مہینوں کے اندر ھی اندر گرے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہےگا: "کپتان ھوپ، مستولوں پر چڑھتے چڑھتے میری کہنیوں کی کھال چھل گئی، میری پیٹھ اور پسلیاں پھوڑے کی طرح دکھ رھی ھیں، میری انگلیاں مڑ نہیں پاتیں، سر درد کی شدت سے پھٹا جا رھا ھے اور پاؤں کانپ رھے ھیں۔ مجھے اسی پونڈ وزن کے یہ سارے گیلے رسے اپنے ھاتھوں سے اٹھانے پڑتے ھیں، مختلف چیزوں کو ان کی جگہوں پر روکے رکھنے والے یہ سارے رسے، یہ آھنجے، یہ تار، مستولوں کی چوٹیاں اور چوٹیوں کے آر پار رکھنے کے یہ ٹکڑے میرے نازک جسم کو تباہ کئے دے رھے ھیں۔" اس تقریر کو ذھنی طور پر سننے کے بعد کپتان ھوپ بھی ذھنی طور پر

ھی یہ تقریر کیا کرتا تھا: "تمہارا جہاں بھی جی چاہے، چلے جاؤ، پیارے۔ تمہارے نفیس جسم پر کہیں تارکول چپک گیا ہو تو اسے اپنے گھر میں دھو ڈالنا ــ «روز میموسا» کولون سے۔" کپتان ھوپ کو اپنا ایجاد کردہ یہ کولون سب سے زیادہ مسرور کرتا اور وہ اپنی اس خیالی سرزنش کو ختم کرتے ہوئے بلند آواز سے دھراتا: "ھاں۔ جاؤ، بھاگ جاؤ «روز میموسا» کولون کے پاس۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے کپتان ھوپ کے ذھن پر اس پراثر مکالمے کے نزول کے مواقع کم سے کم تر ہوتے گئے کیونکہ گرے بھنچے ہوئے دانتوں اور زرد چہرے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اس کڑی محنت کو قوت ارادی کی پرعزم کوششوں کے ذریعے جھیلتا جا رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ سخت جہاز کے اس کے وجود کے اندر سما جانے اور عادت کے اناڑی‌پن کی جگہ لے لینے کی بدولت یہ کام روز بہ روز آسان ہی ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی لنگر کی زنجیر کا حلقہ اسے زور کی ٹکر دے کر عرشے پر پٹک دیتا یا رسے باندھنے کے کھمبوں میں نہ لپٹا ہوا کوئی رسا اس کے ہاتھوں سے اتنی تیزی کے ساتھ چھوٹ جاتا کہ ھتھیلیوں کی کھال چھل جاتی یا پھر ہوا کسی بادبان کے گیلے کونے کو جس میں لوھے کا چھلا سلا ہوتا تھا، اس کے منہ پر تھپڑ کی طرح رسید کر دیتی۔ مختصر یہ کہ یہ سارا کام اذیت ہی اذیت تھا اور ھمہ‌وقتی چوکسی کا طالب۔ پھر بھی وہ دھیرے دھیرے اپنی کمر سیدھی کرتے ہوئے چاھے کتنی ہی مشکل سے سانس کیوں نہ لیتا، اس کے چہرے سے نفرت بھری مسکراھٹ کبھی غائب نہیں ہوتی تھی۔ وہ خاموشی کے ساتھ ہر تمسخر، ہر طعنے اور ہر ناگزیر گالی کو برداشت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے نئے ماحول میں دوسرے ملاحوں کا جیسا بن گیا لیکن اس کے بعد وہ اپنی ہر توھین کا جواب مکوں سے دینے لگا۔

ایک بار جب کپتان ھوپ نے اسے ایک بادبان کو سہارے کی مخروطی بلی سے مہارت کے ساتھ باندھتے دیکھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا: «ارے بدمعاش، تم جیت گئے۔» گرے نیچے اتر کے عرشے پر آیا تو ھوپ نے اسے اپنے کیبن میں بلا لیا اور ایک کتاب جس کے کونے کثرت استعمال سے مڑ گئے تھے، کھولتے ہوئے کہا:

"ذرا غور سے سنو۔ سگریٹ نوشی بند کرو! ہم پلے کو کپتان بنانے کے لئے اس کی تربیت شروع کریں گے۔"

اور اس نے پڑھنا بلکہ یوں کہنا چاھئے کہ سمندر کے قدیم الفاظ کا چیخ چیخ کے اعلان کرنا شروع کر دیا۔ یہ تھا گرے کا اولین سبق۔ سال بھر میں اس نے جہاز رانی، جہاز سازی، سمندری سفر سے متعلق قوانین، جہاز رانی کی سمتوں اور حساب کتاب رکھنے کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ کپتان ھوپ نے مصافحے کے لئے اس کی طرف ھاتھ بڑھایا اور اپنا اور اس کا تذکرہ "ہم" کہہ کر کیا۔

گرے کو اس کی ماں کا آنسوؤں اور طرح طرح کے وسوسوں سے بھرا ہوا خط وانکاویر میں ملا۔ اس نے جواب دیا: "میں سب جانتا ہوں۔ لیکن کاش آپ اس طرح دیکھ سکتیں جیسے میں دیکھتا ہوں، کاش آپ چیزوں کو میری آنکھوں سے دیکھ سکتیں۔ اگر آپ اسی طرح سن سکتیں جیسے میں سنتا ہوں ــ ذرا کسی گھونگے کو کان سے تو لگائیے، اس میں ایک دائمی لہر کی آواز موجود ہوتی ہے؛ اگر آپ اس طرح محبت کر سکتیں جیسے میں کرتا ہوں ــ ہر شے سے تو مجھے آپ کے خط میں محبت اور ایک چیک کے علاوہ مسکراہٹ بھی ملی ہوتی۔" اور وہ جہازراں کی زندگی گزارتا رہا یہاں تک کہ "انسیلم" ایک روز ڈوبیلٹ کے لئے سامان لادے ہوئے وہاں پہنچا۔ جہاز لنگرانداز تھا تب بیس سالہ گرے محل کو دیکھنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

محل کی ایک ایک چیز ہمیشہ ہی کی جیسی تھی، سارا ماحول اپنی تفصیلات اور عام تاثر میں اتنا ہی پاک صاف تھا جتنا کہ پانچ سال قبل حالانکہ ایلم کے نوخیز درختوں کی چوٹیاں اب کچھ اور بلند ہو گئی تھیں اور ان سے عمارت کے سامنے کے حصے پر جو نقش و نگار سے بن جایا کرتے تھے وہ اپنی جگہوں سے ہٹ کر زیادہ وسعت اختیار کر گئے تھے۔

نوکر دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچے، خوشی سے بےقابو ہو گئے، بھونچکے سے رہ گئے اور پھر کچھ اتنے احترام کے ساتھ بت بن کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے جیسے انہوں نے اس گرے کو ابھی کل ہی دیکھا ہو۔ اسے بتایا گیا کہ اس کی ماں کہاں ہے۔ وہ دروازے کو اپنے پیچھے دھیرے سے بند کر کے بلند دیوان‌خانے میں داخل ہوا اور چپ چاپ کھڑے ہو کر سیاہ کپڑوں میں ملبوس عورت پر جس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے، نظریں جما دیں۔ وہ حضرت عیسی کے مصلوب کئے جانے کی تصویر کے سامنے کھڑی چپکے چپکے جو دعا مانگ رہی تھی وہ اسی طرح سنائی دے رہی تھی جیسے دل کی زوردار دھڑکنیں۔ "اور رحمت نازل کر ان پر جو سمندروں میں ہیں، جو راہ‌گیر ہیں، جو بیمار ہیں، جو اذیت میں مبتلا ہیں، جو قیدی ہیں" گرے کو جو تیز تیز سانسیں لے رہا تھا، یہ الفاظ سنائی دئے۔ اس کے بعد: "اور میرے بیٹے پر..." تب وہ بول پڑا: "میں..." اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ماں اس کی طرف مڑی، وہ کچھ اور دبلی ہو چکی تھی۔ اچانک اس کے ترشے ترشائے چہرے کی تمکنت ایک نئی کیفیت سے چمک اٹھی جیسے جوانی واپس آ گئی ہو۔ وہ تیزی سے بیٹے کی طرف لپکی۔ حلق سے نکلتا قہقہہ، ایک دبا دبا سا کلمہ فجائیہ اور اس کی آنکھوں کے آنسو ــ سب کچھ بس یہی تھا۔ لیکن سن رسیدہ خاتون نے اس لمحے کو اپنی تمام گزشتہ زندگی کی بہ‌نسبت کہیں زیادہ بھرپور، کہیں زیادہ پرمسرت طور پر گزارا۔

"میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا، میرے پیارے، میرے بچے!"

اور گرے واقعی بچہ سا بن گیا۔ اس نے ماں سے اپنے باپ کے انتقال کی تفصیلات سنیں پھر اسے خود اپنے بارے میں بتایا۔ وہ گرے کی باتیں سرزنش یا احتجاج کے بغیر غور سے سنتی رہی لیکن خود اسے ہر اس چیز میں جسے وہ اپنی زندگی کی بنیاد قرار دے رہا تھا، محض کھلونے ہی نظر آئے جن سے اس کا بیٹا کھیل رہا تھا۔ یہ کھلونے براعظموں، سمندروں اور جہازوں پر مشتمل تھے۔

گرے نے محل میں سات دن گزارے۔ آٹھویں دن وہ ایک کثیر رقم لے کر ڈوبیلٹ آ گیا اور کپتان ہوپ سے کہا:

"بہت بہت شکریہ۔ آپ میرے بہت اچھے دوست رہے ہیں۔ الوداع، میرے اتالیق۔" اس نے لفظوں پر آهنی شکنجے جیسے طاقتور مصافحے کی مہر ثبت کر دی۔ "اب میں اپنا نجی جہاز چلایا کروں گا۔"

ہوپ کا خون کھول اٹھا، اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا، اپنا ہاتھ جھٹکے کے ساتھ کھینچا اور اکڑتا ہوا چل دیا لیکن گرے لپک کے اس کے پاس پہنچا اور اپنا بازو اس کے شانوں پر رکھ دیا۔ اور اس طرح وہ لوگ جو عملے کو ملا کر چوبیس افراد تھے، ساتھ ساتھ ایک شراب خانے میں گئے جہاں پیتے، چیختے چلاتے، گاتے اور کھاتے رہے یہاں تک کہ بار اور باورچی‌خانے میں جو کچھ بھی تھا سب ان کے پیٹوں کی نذر ہو گیا۔

لیکن کچھ دیر بعد شام کا ستارہ ڈوبلیٹ بندرگاہ میں ایک نئے مستول کی سیاہ لکیر پر چمک اٹھا۔ یہ تھا "سیکریٹ"، دو سو ساٹھ ٹن وزنی، تین مستولی جہاز جسے گرے نے خرید لیا تھا۔ آرتھر گرے اس جہاز کو مالک اور کپتان کی حیثیت سے مزید چار برسوں تک چلاتا رہا اور تب قسمت اسے لیس لے آئی۔ تاہم اس نے اس مختصر، حلق سے نکلے ہوئے قہقہے کو ہمیشہ یاد رکھا تھا جس سے گھر میں اس کا استقبال کیا گیا تھا اسی لئے سال میں دو بار اپنے محل کو جایا کرتا تھا اور اس کی سفید سر ماں غیر یقینی احساس کے ساتھ سوچتی تھی کہ اتنا بڑا لڑکا شاید اب اپنے کھلونوں کو قابو میں رکھ سکے گا۔

۳

سویرا

گرے کے جہاز "سیکریٹ" کے دنبالے کے چھوڑے ہوئے جھاگ کے دھارے نے سفید لکیر کی طرح سمندر کو پار کیا اور لیس کی شام کی روشنیوں میں کھو گیا۔ جہاز لائٹ ہاؤس کے نزدیک لنگر انداز ہو گیا۔

اگلے دس دنوں تک "سیکریٹ" ٹسر ریشم، کافی اور چائے بندرگاہ پر اتارتا رہا۔ گیارھواں دن عملے نے ساحل پر مےنوشی کے ساتھ آرام کرتے ہوئے گزارا لیکن بارھویں دن گرے پر ایسی مایوسی اور ناامیدی طاری ہو گئی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

وہ صبح کو ابھی بیدار ہوا ہی تھا کہ اسے وہ دن سیاہ کفن میں لپٹا ہوا سا معلوم ہوا۔ اس نے افسردگی سے کپڑے پہنے، بےدلی سے ناشتہ کیا، اخبار پڑھنا بھول گیا اور بےسود ہیجان کی ناقابل بیان کیفیت میں کھویا ہوا دیر تک پائپ پیتا رہا۔ غیر واضح طور پر ابھرتے ہوئے الفاظ کے درمیان غیر تسلیم‌شدہ خواھشات منڈلا رہی تھیں، ایک دوسرے کو مساوی قوت سے تباہ کر رہی تھیں۔ پھر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔

گرے نے بڑے ملاح کے ساتھ جہاز کا معائنہ کیا اور بعض رسوں کے کسے اور بعض کے ڈھیلے کئے جانے، جہاز کے اگلے سرے اور لنگروں کے بیچ کی جگہ کی صفائی، بادبان کے ایک گوشے سے بندھے ہوئے رسے کی تبدیلی، عرشے پر تارکول لگائے جانے، پرکار کے پونچھ کر صاف کئے جانے اور جہاز کے تہہ‌خانے کو کھول کے وھاں ہوا پہنچانے اور جھاڑو دینے کی ھدایات جاری کیں۔ تاھم اس سب سے اس کی افسردگی نہ دور ہوئی۔ دن کی بےکیفی کے بےچین احساس کے ساتھ اس نے اسے جھنجلاھٹ اور اداسی میں گزار دیا، اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو پر وہ فراموش کر بیٹھا ہو کہ پکارنے والا کون تھا اور کہاں سے اسے پکارا تھا۔

شام کے قریب اس نے اپنے کیبن میں بیٹھ کے ایک کتاب اٹھائی اور اس کے حاشیوں پر متضاد نوعیت کی مختصر عبارتیں لکھ لکھ کر مصنف سے بحث کرتا رہا۔ کچھ دیر تک وہ اس کھیل سے، مردہ شخص سے جو قبر کے اندر سے اپنے اثرات استعمال کر رہا تھا، اپنی اس گفتگو سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر پائپ سلگا کر وہ نیلگوں دھوئیں میں ڈوب گیا، اس کی بدلتی ہوئی سطحوں پر نمودار ہوتے ہوئے خیالی گل بوٹوں میں کھو گیا۔

تمباکو بڑی قوی‌الاثر ہوتی ہے۔ جیسے لہروں کے درمیانی شگافوں میں تیل ڈالنے سے ان کی غضبناکی کم ہو جاتی ہے اسی طرح تمباکو نوشی جھنجلاھٹ کو کم کر کے جذبات کے ہیجان کو بڑی حد تک گھٹا دیتی ہے، ان میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ تین پائپوں کے بعد گرے کی افسردگی آخرکار اپنی جارحانہ نوعیت سے محروم ہو کر ذہنی پریشاں خیالی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ کیفیت مزید ایک گھنٹے تک جاری رہی جس کے بعد گرے کی روح پر سے کہرا چھٹ گیا، وہ چونک پڑا اور ورزش کے لئے بےتاب ہو کر عرشے پر آ گیا۔ رات ہو چکی تھی، جہاز کے کنارے کنارے خوابیدہ سیاہ پانیوں میں مستولی لالٹینوں کی روشنیاں اور ستارے اونگھ رہے تھے۔ کسی رخسار جیسی گرم ہوا سمندر کی مہک لئے ہوئے اس کے پاس آئی۔

گرے نے سر اٹھا کے سونے کی طرح چمکتے ہوئے ایک ستارے کو دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے کسی دور دراز سیارے کی آتشیں سوئی اس کی پتلیوں میں چبھ گئی۔ شہر کی دبی دبی سی آوازیں کھاڑی کی گہرائیوں سے اس کے کانوں میں پہنچیں۔ کبھی کبھی ساحل سے کسی کی بات کا کوئی فقرہ پانی کی زودحس سطح کو پار کرتا ہوا اس طرح صاف صاف سنائی دیتا تھا جیسے عرشے پر کہا گیا ہو اور پھر یہ مستولوں کی چرمراہٹ میں ڈوب جاتا۔ اتنے میں اگلے بلند عرشے پر ماچس کی تیلی جلی اور اس نے ایک ہاتھ، دو گول گول آنکھوں اور مونچھوں کو منور کر دیا۔ گرے نے سیٹی بجائی۔ جلتے ہوئے پائپ نے جنبش کی اور اس کی طرف تیرنے لگا۔ جلد ہی تاریکی میں کپتان کو پہریدار کے ہاتھ اور چہرہ دکھائی دیا۔

"ذرا لتیکا سے کہہ دو کہ اسے میرے ساتھ چلنا ہے" گرے نے کہا۔ "کہنا کہ مچھلی کے شکار کا سامان لیتا چلے۔"

وہ جہاز سے ایک کشتی میں اترا جہاں اس نے لتیکا کا کوئی دس منٹ تک انتظار کیا۔ اتنے میں لتیکا نے جو عیار آنکھوں والا ایک پھرتیلا نوجوان تھا، چپو کشتی کے پہلو سے ٹکراتے ہوئے گرے کو پکڑائے، پھر خود نیچے اتر کر چپوؤں کو ان کے حلقوں میں پھنسایا اور سامان کا تھیلا دنبالے میں اٹکا دیا۔ گرے چپوؤں کے پاس بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے، کپتان؟" لتیکا نے صرف دائیں چپو سے کشتی کو ایک دائرے میں چلاتے ہوئے پوچھا۔ کپتان خاموش رہا۔ ملاح جانتا تھا کہ کپتان کی خاموشی میں خلل نہیں ڈالا جا سکتا اس لئے وہ بھی خاموش ہو گیا اور تیزی سے کشتی چلانے لگا۔

گرے کشتی کو کچھ دور تک سمندر میں لے گیا اور پھر بائیں جانب کنارے کنارے چلانے کو کہا۔ اسے اس کی فکر نہ تھی کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ چپو چرمرا رہے تھے، پانی کے چھینٹے اڑا رہے تھے ــ باقی سب سمندر تھا اور سناٹا۔

دن کے دوران انسان اتنے زیادہ خیالات، تاثرات، باتوں اور لفظوں پر توجہ مبذول کرتا ہے کہ ان سب کو یکجا کر دیا تو ان سے موٹی موٹی کتابیں تیار ہو جائیں۔ دن کا چہرہ ایک واضح تاثر اختیار کر لیتا ہے لیکن آج گرے کی اس چہرے کو تلاش کرنے کی کوشش بےسود ثابت ہوئی تھی۔ اس دن کا غیر واضح چہرہ ان جذبات میں سے ایک سے منور تھا جو ہوتے تو بہت سے ہیں لیکن ان کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ بہرحال انہیں کوئی بھی نام دے دیا جائے یہ ہمیشہ ہی الفاظ بلکہ تصورات تک کی رسائی سے باہر ہی رہیں گے جیسے کسی خوشبو کا اثر۔ گرے بھی اس وقت ایسے ہی ایک جذبے کے رحم و کرم پر تھا۔ یقیناً وہ کہہ سکتا تھا: "میں منتظر ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو جائےگا" ــ لیکن یہ الفاظ بھی اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتے تھے جتنے کہ کسی عمارت کے تصور کے سلسلے میں اس

کے مختلف حصوں کے علاحدہ علاحدہ خاکے۔ پھر بھی ان خیالات میں تابناک جوش وخروش کی قوت تو تھی ھی۔

بائیں جانب ساحل تیرگی کی لہردار دبازت کی طرح نمودار ھوا۔ چمنیوں سے نکلتی ھوئی چنگاریاں کھڑکیوں کے سرخ شیشوں کے اوپر رقصاں تھیں۔ یہ کپرنا تھا۔ گرے کو چیخ پکار، تو تو میں میں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گاؤں کی روشنیاں انجن کے آتش‌دان کے اس دروازے سے مشابہ تھیں جس میں جلنے سے ننھے ننھے سوراخ ھو گئے ھوں اور آپ ان سے جھانک کر اندر دھکتے ھوئے انگاروں کو دیکھ سکیں۔ دائیں جانب سمندر پھیلا ھوا تھا، اتنا ھی حقیقی جتنی کہ کسی خوابیدہ شخص کی موجودگی۔ کپرنا سے کچھ آگے بڑھ کر گرے نے ساحل کا رخ کیا۔ اس جگہ پانی کناروں سے دھیرے دھیرے ٹکرا رھا تھا۔ اس نے لالٹین جلائی تو اسے راس کے گڈھے اور اس کی آگے کو نکلی ھوئی چٹانیں نظر آئیں۔ اسے یہ جگہ پسند آئی۔

"ھم لوگ مچھلی کا شکار یہیں کھیلیں گے" گرے نے چپو چلانے والے کے شانے کو تھپتھپاتے ھوئے کہا۔

ملاح نے کھوئے کھوئے سے انداز میں حلق صاف کرنے کی جیسی آواز نکالی۔

"یہ پہلا موقع ھے جب میں ایسے کپتان کے ساتھ سمندر میں سفر کر رھا ھوں" اس نے منھ ھی منھ میں کہا۔ "بہت ھی معقول کپتان ھے لیکن عام کپتانوں جیسا ھرگز نہیں۔ سخت قسم کا کپتان ھے۔ اس کے باوجود میں اسے پسند کرتا ھوں۔"

اس نے چپو کیچڑ میں گاڑ کے کشتی کو اس سے باندھ دیا اور وہ پتھروں پر سے جو ان کے گھٹنوں اور کہنیوں کے نیچے سے لڑھک لڑھک کر گر رھے تھے، بہ‌دقت چڑھ کے اوپر آئے۔ راس کے ٹیلے پر جھاڑیوں اور درختوں کا ایک جھنڈ کھڑا تھا۔ ذرا ھی دیر بعد کلہاڑی سے کسی خشک تنے کے پھاڑے جانے کی آوازیں سنائی دیں۔ لتیکا نے لکڑی کاٹ کے راس پر الاؤ جلا دیا۔ پرچھائیں متحرک ھو گئیں، شعلوں کا عکس پانی میں پڑنے لگا اور چھٹتی ھوئی تاریکی میں گھاس اور شاخیں نظر آنے لگیں۔ الاؤ کے اوپر کی فضا جس میں دھواں بھی شامل تھا، چمک اٹھی۔

گرے الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔

"لو" اس نے ایک بوتل بڑھاتے ھوئے کہا، "ان سب کے نام پر پیو، میرے دوست لتیکا جو کبھی چکھتے بھی نہیں۔ اور ھاں تم جو وادکا لائے ھو نا اسے کنین سے نہیں بلکہ ادرک سے ذائقے دار بنایا گیا ھے۔"

"معاف کیجئے گا، کپتان" ملاح نے پل بھر کے لئے سانس روک کر کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ھو تو میں اس کے ساتھ پیوں گا..." یہ کہہ کر اس نے بھنی ھوئی مرغی کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ لیا اور اس کا ایک بازو منھ سے نکالتے ھوئے اپنی بات جاری رکھی: "جانتا ھوں کہ آپ کنین پسند کرتے ھیں۔ لیکن اندھیرا تھا اور میں

عجلت میں تھا۔ ادرک دراصل انسان میں جھنجلاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ مجھے جب کسی سے لڑنا ہوتا ہے تو میں ہمیشہ ادرک کی وادکا پیتا ہوں۔"

کپتان خورد و نوش میں مصروف تھا تو ملاح بار بار اسے کن‌انکھیوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ آخرکار جب ضبط کرنا ناممکن ہو گیا تو اس نے کہا:

"اچھا کپتان، لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ سچ ہے کیا؟ واقعی آپ کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے ہے؟"

"اس کی خاک بھی اہمیت نہیں، لتیکا۔ اپنی ڈور اٹھاؤ اور جی چاہے تو کچھ دیر مچھلی کا شکار کھیلو۔"

"اور آپ؟"

"میں؟ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ شاید میں بھی شکار کھیلوں لیکن... بعد میں۔"

لتیکا نے اپنی ڈور کھولی اور اس دوران گانے کے سے انداز میں وہ الفاظ ادا کرنے لگا جن میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور جن سے جہاز کا عملہ بہت محظوظ ہوا کرتا تھا۔

"ایک ڈور اور لکڑی کے ایک ٹکڑے سے میں نے ایک بہت ہی عمدہ، لمبا کوڑا تیار کیا۔ پھر میں نے اس میں باندھنے کے لئے ایک کنٹیا ڈھونڈ لی اور جلدی سے تیز سیٹی بجائی۔" وہ ٹین کے ایک ڈبے کو کریدنے لگا جس میں کیچوے رکھے تھے۔ "یہ بوڑھا کیچوا بل میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا لیکن اب میں نے اسے کنٹیا میں اچھی طرح پھنسا دیا ہے اور پرچ مچھلیاں میری شکر گزار ہوں‌گی۔" آخرکار وہ گاتا ہوا چل دیا: "چاندنی چمک رہی ہے، وادکا شاندار ہے، مچھلیو غور سے سن لو، میں قریب آ رہا ہوں۔ ہیرنگو، بےہوش ہو جاؤ، اسٹرجنو، پانی کی سطح پر آ جاؤ، لتیکا یہاں شکار کھیل رہا ہے!"

گرے الاؤ کے پاس لیٹ کے پانی اور آگ کی لپٹوں کے عکس کو تکنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا لیکن کسی کوشش کے بغیر۔ اس حالت میں انسان کا ذہن اپنے گرد و پیش کا بےخیالی میں مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا غیرواضح طور پر ہی ادراک کر پاتا ہے۔ یہ دھکاپیل کرتے ہوئے گلے کے کسی اصیل گھوڑے کی طرح تیزی سے آگے بڑھتا ہے، کچلتا، دھکے دیتا اور ٹھہرتا ہوا۔ خالی پن، انتشار اور تاخیر باری باری اس کے ہم‌رکاب ہوتے ہیں۔ یہ چیزوں کی روحوں میں بھٹکتا ہے، روشن اضطراب سے بہ‌عجلت خفیہ اطلاعات تک پہنچتا ہے، کبھی زمین پر ہوتا ہے تو کبھی آسمان پر، زندگی کے موضوع پر خیالی شخصیتوں سے ہم‌کلام ہوتا ہے، انسان کی یادوں کی شمعیں کبھی گل کر دیتا ہے اور کبھی انہیں سجاتا سنوارتا ہے۔ دھندلی دھندلی اس جنبش و حرکت کے دوران ہر شے جیتی جاگتی اور قابل لمس ہوتی ہے اور ہر شے کچھ اتنی بےترتیبی سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہے جیسے محض تصور کا وہم ہو۔ اور انسان کا سکون حاصل کرتا ہوا شعور اکثر یہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے کہ مثال

کے طور پر زندگی سے متعلق اس کے خیالات کو اچانک ایک نہایت ہی غیرمتوقع ملاقاتی نے ٹوک دیا ہے: دو سال قبل ٹوٹی ہوئی شاید کوئی ٹہنی۔ تو الاؤ کے پاس اس نوعیت کے تھے گرے کے خیالات لیکن وہ وہاں نہیں بلکہ "کہیں اور" تھا۔

اس کی کہنی جس کا سہارا لئے، سر کو ہتھیلی پر ٹکائے وہ لیٹا ہوا تھا، نم اور سن ہو گئی۔ ستارے ماند پڑ چکے تھے۔ تیرگی کو علی‌الصباح سے قبل کے ہیجان نے کچھ اور بھی دبیز کر دیا تھا۔ کپتان اونگھ رہا تھا لیکن اسے اس کا احساس نہ تھا۔ اس کا کچھ پینے کو جی چاہا اور اس نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھا کر سونے کی حالت میں اسے کھولا۔ اس کے بعد اس کے خوابوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اگلے دو گھنٹے اس کے لئے ان لمحات سے زیادہ طویل نہ ثابت ہوئے جبکہ اس نے اپنا سر بازوؤں پر رکھا تھا۔ اس دوران لتیکا دو بار الاؤ کے پاس آیا تھا، اس نے سگریٹ پی تھی اور تجسس کے تحت یہ دیکھنے کے لئے اپنی پکڑی ہوئی مچھلیوں کے منہ میں جھانکا تھا کہ جانے اندر کیا ہو۔ مگر بالکل فطری طور پر، کچھ بھی نہ تھا۔

بیدار ہونے پر گرے پل بھر کے لئے بھول گیا کہ وہ اس جگہ کیسے پہنچا تھا۔ اس نے بڑی حیرت کے ساتھ صبح کی پرجوش تابندگی، شاخوں سے سجے سجائے راس اور چمکتی ہوئی نیلگوں دوری کو دیکھا۔ ہیزل کی ایک جھاڑی کی پتیاں افق پر اور خود اس کے پیروں پر معلق تھیں۔ راس کے نیچے ـ گرے کو محسوس ہوا کہ وہ جگہ اس کی پیٹھ کے عین پیچھے ہی واقع ہے۔ سمندر کا پانی دھیرے دھیرے ساحل سے ٹکرا رہا تھا۔ شبنم کا ایک سرد قطرہ کسی پتی پر سے ٹپک کے اس کے چہرے پر بکھر گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف نور کی حکمرانی ہو چکی تھی۔ الاؤ کی دم توڑتی ہوئی لپٹیں دھوئیں کے باریک دھاگوں کے سہارے زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کی مہک شاداب جنگل کی ہواؤں میں سانس لینے کی مسرت میں تندی و تیزی کا اضافہ کر رہی تھی۔

لتیکا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، وہ ہر شے سے بےنیاز کسی پکے جواری کے جیسے جوش و خروش سے شکار میں مصروف تھا اور پسینے سے شرابور۔ گرے راس سے جھاڑیوں‌دار ڈھلان پر چل پڑا۔ گھاس دھواں دے رہی تھی، لپٹیں نکال رہی تھی، شبنم آلود پھول ان بچوں جیسے معلوم ہو رہے تھے جنہیں زبردستی ٹھنڈے پانی سے نہلا دیا گیا ہو۔ سبز دنیا اپنے بےشمار ننھے ننھے دھنوں سے سانس لے رہی تھی، اپنے جوش نشاط سے جھومتے ہوئے جھنڈوں سے گزرنے والے گرے کی راہ روک رہی تھی۔ آخرکار کپتان ایک کھلی ہوئی جگہ میں پہنچا جہاں سبزے اور لالہ و گل کی فراوانی تھی اور یہاں اس نے ایک خوابیدہ دوشیزہ کو دیکھا۔

وہ احتیاط سے ذرا الگ ہٹ کے ایک شاخ کے پہلو میں کھڑا ہو گیا جیسے کوئی خطرناک چیز دریافت کر لی ہو۔ لیکن وہ تو تھکی ہوئی اسول تھی جو یوں

سمٹی سمٹائی لیٹی تھی کہ ایک ٹانگ نیچے مڑی ہوئی تھی اور دوسری پھیلی ہوئی اور سر آرام سے تلے اوپر رکھے ہوئے ھاتھوں پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے، گلے کا ایک بٹن کھل گیا تھا جس سے ننھا سا سفید گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ مڑے ہوئے سائے نے گھٹنوں کو کھول دیا تھا۔ اس کی پلکیں بالوں کی ایک لٹ سے نصف ڈھکی ہوئی خوبصورت ھلالی ابروؤں کی چھاؤں میں رخساروں پر محو خواب تھیں۔ سر کے نیچے دبے ہوئے دائیں ھاتھ کی چھنگلیا سیاہ بالوں پر مڑی ہوئی تھی۔ گرے بیٹھ کے نیچے سے لڑکی کے چہرے کو تکنے لگا اور اس کے ذھن میں خیال تک نہ آیا کہ وہ اس وقت آرنلڈ بوکلین کی بنائی ہوئی تصویر کے فان* سے کتنا مشابہ معلوم ہو رہا ھے۔

شاید دوسرے حالات میں گرے نے اس لڑکی کو صرف اپنی آنکھوں ھی سے دیکھا ہوتا لیکن وہ اس وقت اسے مختلف انداز سے تک رہا تھا۔ اس کے وجود کی ہر شے تڑپ اٹھی تھی، مسکرا رہی تھی۔ وہ نہ لڑکی سے واقف تھا نہ اس کے نام سے اور نہ ھی یہ جانتا تھا کہ وہ ساحل پر کیوں سو گئی ھے لیکن اس سب پر بےحد مسرور تھا۔ وہ ایسی تصویروں کو پسند کرتا تھا جن کے ساتھ نہ کوئی وضاحتی تحریر ہو اور نہ ھی نیچے کوئی عنوان۔ اس قسم کی تصویر جو تاثر پیدا کرتی ھے وہ کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ھے۔ اس کا مواد لفظوں کی قیود و حدود سے آزاد ہونے کی بنا پر ہر قسم کی قیاس آرائیوں اور خیالوں کی تصدیق کرتا ہوا لامحدود بن جاتا ھے۔

پتیوں کی پرچھائیاں تنوں کے قریب آتی جا رہی تھیں مگر گرے اب بھی وھیں، اسی غیر آرام‌دہ حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی سے متعلق ہر شے خوابیدہ تھی: کالے کالے بال سو رہے تھے، لباس سو رہا تھا، سائے کی شکنیں سو رہی تھیں، اس کے جسم کے قریب کی گھاس تک ھمدردی سے اونگھتی معلوم ہو رہی تھی۔ تاثر مکمل ہو گیا تو گرے اس تاثر کی گرم، وجود پر چھا جانے والی لہروں میں داخل ہو گیا، اس تاثر کی کشتی پر روانہ ہو گیا۔ لتیکا کچھ دیر سے پکار رہا تھا: "کپتان! آپ کہاں ھیں؟" لیکن کپتان کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔

آخرکار جب وہ اٹھ کے کھڑا ہوا تو غیرمعمولی بات کو ترجیح دینے کے جذبے نے کسی غصے سے بپھری ہوئی عورت کے سے عزم اور حوصلے سے اسے آ دبوچا۔ اس نے اداسی کے ساتھ اس جذبے سے مغلوب ہو کر اپنی نہایت ھی عزیز پرانی انگوٹھی انگلی سے یہ سوچتے ہوئے — اور بلا سبب نہیں — اتاری کہ اس طرح وہ زندگی کے لئے علم حروف جیسی کسی لازمی چیز کی طرف اشارہ کر رہا ھے۔ اس نے یہ انگوٹھی دھیرے سے لڑکی کی چھنگلیا میں پہنا دی جو اس کے سر کے نیچے اجلی اجلی نظر آ رہی تھی۔ چھنگلیا برا مان کر کچھ کسمسائی اور مڑ گئی۔ گرے نے ایک بار پھر خوابیدہ

---

* فان — رومن دیوتا جو گڈریوں کا محافظ تصور کیا جاتا تھا۔ مترجم۔

چہرے کی طرف دیکھا اور مڑا تو اسے ملاح کی تنی ہوئی بھویں نظر آئیں۔ لتیکا اپنے کپتان کی حرکتوں کو کچھ اس قسم کے استعجاب سے منہ کھولے دیکھ رہا تھا جس کا تجربہ حضرت یونس کو مچھلی کے معدے کو دیکھ کر ہوا ہوگا۔

"ارے یہ تم ہو، لتیکا! ذرا لڑکی تو دیکھو۔ ہے نا خوبصورت؟"

"مصوری کا شاندار شاہکار!" کتابی فقروں کے رسیا ملاح نے تیز باریک آواز میں کہا۔ "حالات جس طرح سے پیش آئے ہیں اس میں کسی کے دل کو کسی کی طرف مائل کرنے والی کوئی بات پائی جاتی ہے۔ میں نے چار مچھلیاں پکڑیں اور ایک اور بھی جو پھکنے جیسی گول ہے۔"

"ھش! لتیکا، اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہئے۔"

دونوں اس جگہ سے ہٹ کے جھاڑیوں میں آ گئے۔ اب انہیں کشتی کا رخ کرنا چاہئے تھا لیکن گرے کچھ دیر اور ٹھہرا رہا، اس کی نظریں دور، نچلے کنارے پر منڈلاتی رہیں۔ کپرنا کے گھروں کی چمنیوں سے صبح کا دھواں نکل نکل کر ہریالی اور ریت پر تیرتا ہوا سا معلوم ہو رہا تھا۔ دھوئیں میں اس نے لڑکی کو ایک بار پھر دیکھا۔

پھر وہ عزم کے ساتھ مڑا اور ڈھلان پر اترنے لگا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کے متعلق ملاح نے کوئی سوال نہ کیا اور اپنے کپتان کے پیچھے ہو لیا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ ایک بار پھر خاموشی لازمی ہے۔ گاؤں کے اولین مکانوں کے پاس پہنچ کر گرے نے اچانک کہا:

"اچھا لتیکا، کیا تمہاری تجربےکار آنکھیں ہمیں بتا سکتی ہیں کہ شراب‌خانہ کہاں ہے؟"

"اسی سیاہ چھت والی عمارت میں ہونا چاہئے" لتیکا نے غور کرتے ہوئے کہا، "مگر میرا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"اس چھت میں بھلا ایسی کون سی خاص بات ہے؟"

"میں ٹھیک سے کچھ کہہ نہیں سکتا، کپتان۔ اسے میرے دل کی آواز سمجھئے اور بس۔"

وہ عمارت کے پاس پہنچے جو واقعی مینرس کے شراب‌خانے کی ہی تھی۔ انہیں کھلی کھڑکی سے ایک میز پر رکھی ہوئی بوتل نظر آ رہی تھی، قریب ہی کسی کا گندہ ہاتھ گھری خاکستری مونچھوں کو اینٹھ رہا تھا۔ دن ابھی شروع ہی ہوا تھا لیکن مشترکہ کمرے میں تین آدمی پہنچ چکے تھے۔ کھڑکی کے پاس نشے میں دھت متذکرہ بالا مونچھوں کا مالک کوئلے والا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دو ماہی‌گیر بار اور اندرونی دروازے کے بیچ رکھی ہوئی ایک میز کے پاس بیٹھے تھے جس پر تلے ہوئے کچھ انڈے اور بیئر رکھی تھی۔ مینرس جو انہوریوں دار پھیکے چہرے اور کوتاہ‌بین آنکھوں میں تاجروں سے عام طور پر مخصوص کھلی ہوئی عیاری کے تاثر والا لمبا تڑنگا نوجوان تھا، کاؤنٹر کے

پیچھے پلیٹیں دھو رہا تھا۔ دھوپ نے کھڑکی کے چوکھٹے کا گندے فرش پر نقش سا بنا رکھا تھا۔

گرے کے دھوئیں‌دار روشنی کے اس ٹکڑے پر نمودار ہوتے ھی مینرس نے تعظیماً سر جھکایا اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس نے فوراً ھی بھانپ لیا تھا کہ گرے **صحیح معنوں میں** کپتان ھے، اس قسم کے گاھک اس کے ھاں شاذ و نادر ھی دکھائی دیتے تھے۔ گرے نے رم کی فرمائش کی۔ مینرس میز پر کثرت استعمال سے زرد پڑ جانے والا میزپوش بچھا کر رم کی ایک بوتل لے آیا لیکن ایسا کرنے سے قبل بوتل کے لیبل کے کونے کو جو اکھڑ گیا تھا، زبان سے چاٹ کر دوبارہ چپکا دیا۔ پھر وہ اپنے کاؤنٹر کے پیچھے واپس چلا گیا جہاں سے کبھی گرے کو غور سے دیکھنے لگا اور کبھی اس پلیٹ کو جس پر سے کھانے کے چپکے ہوئے خشک ریزے کو صاف کر رھا تھا۔

لتیکا نے اپنے گلاس کو دونوں ھاتھوں میں اٹھا لیا تھا اور اب اس سے نرم لہجے میں سرگوشیاں کرتے ہوئے کھڑکی کے باھر دیکھ رھا تھا۔ اس اثنا میں گرے نے ھین مینرس کو اپنے پاس بلایا۔ ھین آ کر اپنے آپ سے مطمئن ہونے کا تاثر دیتا ہوا ایک کرسی کے کونے پر بیٹھ گیا، وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رھا تھا کہ اسے مخاطب کیا گیا ھے اور وہ بھی گرے کی انگلی کے محض ھلکے سے اشارے سے۔

"میرا خیال ھے کہ آپ سارے مقامی باشندوں سے واقف ھیں" گرے نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "میں ایک لڑکی کا نام معلوم کرنا چاھتا ہوں جو سر پر رومال باندھتی ھے، لباس پر گلابی رنگ کے پھول بنے ھیں، بال سنہرے ھیں، قد اوسط درجے کا ھے اور عمر سترہ اور بیس کے درمیان۔ میں نے اسے یہاں سے قریب ھی ایک جگہ دیکھا ھے۔ کیا نام ھے اس کا؟"

اس نے قوت کی مستحکم سادگی کے ساتھ بات کی تھی جس کی بنا پر اس کے لہجے کی سنجیدگی کو نظرانداز کرنا ناممکن تھا۔ ھین مینرس باطنی طور پر بوکھلا گیا اور احمقانہ انداز میں زیر لب مسکرایا بھی لیکن ظاھری طور پر اس نے تخاطب کی نوعیت کے آگے سر خم کر دیا۔ تاھم جواب دینے سے قبل وہ کچھ ھچکچایا — محض یہ بھانپنے کی بےسود خواھش کے تحت کہ آخر قصہ کیا ھے۔

"ھونہہ!" اس نے چھت کی طرف آنکھیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو «رواں جہاز اسول» ہوگی۔ لڑکی کچھ سنکی ھے۔"

"واقعی؟" گرے نے اپنے گلاس سے بڑی سی چسکی لیتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ "آخر وہ ایسی کیوں ھے؟"

"آپ سچ مچ جاننا چاھتے ھوں تو میں بتائے دیتا ہوں۔"

اور ھین نے گرے کو سات سال پہلے کا وہ واقعہ بتایا جب لڑکی نے لوک گیت یکجا کرنے والے ایک شخص سے باتیں کی تھیں۔ بالکل فطری طور پر اس قصے نے اس وقت سے جبکہ بھکاری نے شرابخانے میں پہلی بار اس کے وجود کی تصدیق کی تھی،

اب تک، ان برسوں کے دوران بھونڈی اور گندی افواہ کی شکل اختیار کر لی تھی لیکن لب لباب بہرحال نہیں بدلا تھا۔

"اور تب سے اس کا یہی نام پڑ گیا ہے" مینرس نے کہا۔ "وہ «رواں جہاز اسول» کہلاتی ہے۔"

گرے نے غیرشعوری طور پر لتیکا کو دیکھا جس کا طرز عمل اب بھی پرسکون اور انکساارانہ تھا پھر اس کی نظریں شرابخانے کے باہر ڈھول سے اٹی ہوئی سڑک پر پڑیں اور اسے فوراً ہی ایسا محسوس ہوا جیسے اس پر وار کیا گیا ہو۔ ایک ضرب دل پر پڑی تھی اور دوسری دماغ پر۔ سڑک پر اس کی جانب وہی رواں جہاز اسول چلی آ رہی تھی جس پر ابھی ابھی مینرس نے طبی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی تھی۔ اس کے جاذب توجہ خط و خال جو ناقابل فراموش، ولولہ انگیز لیکن سادے الفاظ کے اسرار سے مشابہ تھے، اب اس کی آنکھوں کی تابانی میں گرے کے سامنے نمودار ہوئے۔ ملاح اور مینرس دونوں کی پیٹھیں کھڑکی کی طرف تھیں اور گرے نے اس اندیشے سے کہ کہیں اتفاقاً یہ دونوں مڑ کے سڑک کی طرف نہ دیکھ لیں، دل پر جبر کر کے لڑکی پر سے نظریں ہٹا لیں اور مینرس کی سرخی مائل زرد آنکھوں میں جھانکا۔ گرے کے اسول کی آنکھوں کو دیکھتے ہی مینرس کی بیان کی ہوئی الٹی سیدھی باتوں کا سارا اثر زائل ہو گیا۔ اس دوران ہین نے جس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پل ہی بھر میں کیا ہو گیا ہے، اپنی بات جاری رکھی:

"میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ لڑکی کا باپ جو ہے نا وہ پکا حرامی ہے۔ اس نے میرے والد کو یوں ڈبو دیا جیسے وہ کوئی بلی کتا رہے ہوں۔ خدا مجھے معاف کرے۔ وہ..."

پیچھے بالکل غیرمتوقع طور پر بلند ہونے والی زوردار چیخ نے اس کی بات کاٹ دی۔ کوئلے والے نے جو اپنی مدھوشی کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا، بھیانک انداز میں آنکھیں مٹکا مٹکا کر ایسی بلند آواز سے گانا شروع کر دیا تھا کہ لوگ اپنی جگہوں سے اچھل پڑے:

ٹوکری والے، ارے اے ٹوکری والے، سنو
تم ہماری کھال ٹوکریوں کی خاطر کھینچ لو!

"تم نے پھر بدمستی میں آسمان سر پر اٹھا لیا، لعنت ہو تم پر!" مینرس برس پڑا۔ "نکل جاؤ یہاں سے!"

پر ذرا محتاط ہی رہنا، کہیں ایسا نہ ہو
تم ہمارے چوڑے تابوتوں کے اندر گر پڑو!

کوئلے والا چلایا اور پھر کچھ اس انداز سے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اپنی مونچھیں چھلکتے ہوئے گلاس میں ڈبو دیں۔

مینرس نے بھنا کر شانے اچکائے۔

"یہ دنیا کا ناکارہ‌ترین آدمی ہے" اس نے کنجوس کے خباثت بھرے وقار کے ساتھ کہا۔ "ہر بار یہی ہوتا ہے!"

"اور بھی کچھ ہے جو مجھے آپ بتا سکتے ہیں؟" گرے نے پوچھا۔

"میں؟ میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ اس لڑکی کا باپ پکا حرامی ہے۔ اسی شخص کی وجہ سے جناب عالی، میں یتیم ہو گیا اور مجھے پیٹ پالنے کے لئے لڑکپن ہی میں جان توڑ محنت کرنی پڑی۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو!" کوئلے والا اچانک بول پڑا۔ "تم اتنی بدمعاشی سے، ایسے بناوٹی انداز میں جھوٹ بول رہے ہو کہ میرا نشہ ہرن ہو گیا۔"

ہین کو ابھی منہ کھولنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا کہ کوئلے والا گرے سے مخاطب ہو گیا:

"یہ جھوٹ بول رہا ہے، اس کا تو باپ بھی جھوٹا تھا اور ماں بھی۔ آوے کا آوا ہی خراب ہے۔ یقین مانیے کہ وہ لڑکی ایسی ہی سمجھدار ہے جیسے کہ آپ اور میں۔ میں نے اُس سے بات کی ہے۔ وہ میرے چھکڑے پر چوراسی بار یا اس سے کچھ کم سفر کر چکی ہے۔ کوئی لڑکی شہر سے پیدل واپس ہونے لگتی ہے اور میں اپنا سارا کوئلہ فروخت کر چکا ہوتا ہوں تو ہمیشہ اسے اپنے چھکڑے پر بٹھا لیتا ہوں۔ وہ تو گھوڑے تک پر سوار ہو سکتی ہے۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اس کے شانوں پر جو سر ہے نا وہ کافی سوجھ بوجھ والا ہے۔ اب آپ خود ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تم سے ہین مینرس، وہ کبھی بھی بات نہ کرے‌گی۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، جناب عالی، تو میں کوئلے کی اپنی آزاد تجارت میں گپوں اور افواہوں سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ بڑوں کی طرح باتیں کرتی ہے لیکن اس کی باتوں کا انداز کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ اگر آپ غور سے سنیں تو اس کی باتیں ویسی ہی معلوم ہوں‌گی جیسی آپ کی اور میری اور ہوتی بھی ویسی ہی ہیں پھر بھی مختلف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار ایسا ہوا کہ اس کے پیشے کے متعلق بات چل نکلی۔ «میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتی ہوں» اس نے کہا اور میرے شانے پر یوں ہاتھ رکھا جیسے کوئی مکھی گھنٹے کے مینار پر بیٹھ گئی ہو، «میرا کام غیر دلچسپ نہیں ہے لیکن میں برابر کسی بہت ہی خاص چیز کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ میں ایک ایسی کشتی بنانے کا طریقہ معلوم کرنا چاہتی ہوں جو خود بخود چل سکے اور اس کے ملاح ایسے ہوں جو صحیح معنوں میں کشتی چلا سکیں۔ پھر یہ لوگ ساحل پر آ کر کشتی کو باندھ دیں اور پانی کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھائیں، بالکل اسی طرح جیسے یہ کلونے نہیں بلکہ

جیتے جاگتے ملاح ہوں۔» میں ہنسنے لگا کیونکہ مجھے یہ بات عجیب سی لگی۔ پھر میں نے اس سے کہا: «ارے اسول، تم جو ایسی باتیں سوچتی ہو نا تو اس کا سبب یہ ہے کہ تمہارا کام ہی اس طرح کا ہے لیکن ذرا اپنے چاروں طرف نظریں تو دوڑاؤ، ذرا دیکھو تو کہ دوسرے لوگ کس طرح کام کرتے ہیں، لگتا ہے کہ لڑ رہے ہیں۔» «جی نہیں» وہ کہتی ہے، «میں جو کچھ جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔ کوئی ماہی‌گیر شکار کھیلتا ہے تو برابر سوچتا رہتا ہے کہ وہ کوئی بڑی مچلی پکڑے‌گا، اتنی بڑی جتنی پہلے کبھی کسی کے ہاتھ نہ لگی ہوگی۔» «اور میرے متعلق کیا خیال ہے؟» «آپ؟» وہ ہنس پڑی۔ «میں شرط لگا سکتی ہوں کہ آپ جب اپنا ٹوکرا کوئلے سے بھرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ پھولوں سے بھر جائے‌گا۔» یقین مانیے، اس کے الفاظ یہی تھے! میں اعتراف کر رہا ہوں کہ عین اسی وقت، میں کہہ نہیں سکتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا لیکن بہرحال اپنے خالی ٹوکرے کو دیکھا اور میں نے سچ مچ سوچا کہ ٹوکرا جن ٹہنیوں سے بنا ہے ان میں کلیاں پھوٹتے دیکھ رہا ہوں۔ پھر یہ کلیاں کھل اٹھیں، ان کی پنکھڑیاں سارے ٹوکرے میں پھیلیں اور غائب ہو گئیں۔ میں تو کچھ سنجیدہ بھی ہو گیا! لیکن ہین مینرس انتہائی بےشرمی سے جھوٹ بولے‌گا اور اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگے‌گی — میں اسے خوب جانتا ہوں!"

مینرس نے یہ محسوس کر کے کہ گفتگو نے اس کی کھلی ہوئی توہین کا رخ اختیار کر لیا ہے، کوئلے والے کو قہرآلود نگاہوں سے دیکھا، جا کے اپنے کاؤنٹر کے پیچھے منھ چھپا لیا اور وہیں سے تلخی کے ساتھ پوچھا:

"آپ کو کسی اور چیز کی فرمائش کرنی ہے؟"

"نہیں" گرے نے اپنا بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگ جا رہے ہیں۔ لتیکا، تم یہیں ٹھہر جاؤ۔ شام کو واپس آنا اور کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔ جو کچھ ممکن ہو سکے معلوم کرنا اور آ کے مجھے بتانا۔ سمجھ گئے نا؟"

"میرے پیارے کپتان" لتیکا نے رم کی بخشی ہوئی بےتکلفی سے کہا، "کوئی گونگا بہرا آدمی ہی اس بات کو نہ سمجھ سکے‌گا۔"

"بہت خوب۔ اور یہ نہ بھولنا کہ بہت سے مواقع میں سے جو پیش آ سکتے ہیں، تم ایک موقعے پر بھی میرا ذکر نہیں کر سکتے، میرا نام تک نہیں لے سکتے۔ خدا حافظ!"

گرے چل دیا۔ اسی وقت سے اس کے اندر حیرت‌انگیز دریافتوں کے ایک احساس نے گھر کر لیا، جیسے برتھولڈ کی بارود کی چھوٹی توپ میں کوئی چنگاری — یہ روح میں برف کے ان پھسلتے ہوئے تودوں میں سے ایک تھا جن کے نیچے سے آگ جلتی ہوئی بچ نکلتی ہے۔ اسے فوری اقدام کی خواہش نے مغلوب کر دیا۔ آخر جب وہ کشتی میں سوار ہو گیا تب کہیں جا کر اسے ہوش آیا اور واضح طور پر سوچنے کے قابل ہو

سکا۔ اس نے ھنستے ھوئے اپنا ھاتھ آگے بڑھایا اور ھتھیلی جھلستی ھوئی دھوپ میں اس طرح پھیلا دی جیسے اس نے ایک بار لڑکپن میں شراب کے تہہ خانے میں پھیلائی تھی۔ پھر اس نے کشتی کنارے سے آگے بڑھائی اور اسے بندرگاہ کی طرف تیزی سے کھینے لگا۔

۴

سات سال بعد

لوک گیت یکجا کرنے والے ایگل نے ساحل پر چھوٹی لڑکی کو ارغوانی بادبانوں والے جہاز کی کہانی جس دن سنائی تھی اس کو سات سال پورے ھونے سے دو ایک روز قبل اسول کھلونوں کی دوکان سے جہاں وہ ھفتے میں ایک بار جایا کرتی تھی، پریشان اور اداس واپس ھوئی۔ سب کھلونے جنھیں وہ بیچنے لے گئی تھی، واپس لانے پڑے تھے۔ وہ اتنی زیادہ بوکھلائی ھوئی تھی کہ پہلے تو منہ سے کوئی بات ھی نہ نکل سکی لیکن جب اس نے باپ کے تشویش بھرے چہرے کو دیکھ کر نتیجہ اخذ کیا کہ وہ دراصل جو کچھ ھوا تھا اس سے بھی بری خبر کی توقع کر رھا ھے تو اس نے بتانا شروع کیا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی ھوئی اس کے شیشے پر انگلی پھیرتے ھوئے بےخیالی سے سمندر کو تکے جا رھی تھی۔

دوکان‌دار نے اس روز گفتگو کا آغاز اپنا رجسٹر کھول کر اسے یہ دکھاتے ھوئے کیا تھا کہ بات بیٹی پر اس کی کتنی رقم چڑھ گئی ھے۔ بڑی سی تین عدد کی رقم کو دیکھ کر اسول چکرا سی گئی۔

"یہ تو ھوئی وہ رقم جو تمھیں دسمبر سے اب تک مل چکی ھے" دوکان‌دار نے کہا، "اب یہ دیکھنا چاھئے کہ بکری کتنی رقم کی ھوئی ھے۔" اور اس نے اپنی انگلی ایک اور گنتی کے سامنے رکھ دی جو صرف دو عددوں کی تھی۔

"اس گنتی کو دیکھ کے تو شرم محسوس ھوتی تھی۔ میں دوکان‌دار کے چہرے سے ھی اندازہ لگا رھی تھی کہ وہ بدتمیزی اور غصہ‌گرمی پر اتر آیا ھے۔ میں تو خوشی خوشی وھاں سے بھاگ کھڑی ھوتی لیکن سچ پوچھئے تو میں شرم سے یوں زمین میں گڑ گئی تھی کہ بھاگنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ اور وہ کہتا رھا: «اب میری پیاری لڑکی، یہ سودا میرے لئے منافعے کا نہیں رہ گیا۔ اب تو درآمدشدہ چیزوں ھی کی مانگ ھے۔ ساری دوکانیں باھر کی چیزوں سے پٹی پڑی ھیں، اس طرح کے کھلونوں کو بھلا کون پوچھتا ھے۔» اس نے بہرحال یہی کہا۔ اور بھی جانے کیا کیا کہتا رھا لیکن ساری باتیں میرے ذھن میں گڈمڈ ھو گئیں اور میں سب کچھ بھول بیٹھی۔ اسے شاید میرے

حال پر افسوس ہو رہا تھا کیونکہ اس نے رائے دی کہ مجھے «بچوں کا بازار» اور «علاؤالدین کا چراغ» میں قسمت آزمائی کرنی چاہئے۔"

وہ اہم ترین بات بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر چکی تو اس نے مڑ کر شرماتے ہوئے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا۔ لونگرین جھکا بیٹھا تھا، انگلیاں گھٹنوں کے درمیان جن پر وہ کہنیاں ٹھکائے ہوئے تھا، ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں۔ اس نے بیٹی کی نظروں کو اپنے اوپر محسوس کر کے سر اٹھایا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ اسول نے اپنی پریشانی پر قابو پا لیا، دوڑ کے باپ کے پاس پہنچی، اس کے پہلو میں بیٹھ کر اس کی جیکٹ کی چمڑے کی آستین میں اپنا چھوٹا سا ہاتھ ڈال دیا، ہنس کر نیچے سے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں اور بناوٹی شوخی کے ساتھ بات جاری رکھی:

"فکر نہ کیجئے، یہ ایسی کوئی اہم بات نہیں۔ اب آگے سنئے۔ بہرحال میں دوکان سے نکلی۔ اس کے بعد میں اس بڑے، اس بھیانک اسٹور میں پہنچی۔ وہاں تو کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ مجھے لوگوں کے دھکے کھانے پڑے لیکن میں گھستی پلتی آخرکار ایک سیاہ فام آدمی کے پاس پہنچ ہی گئی جو عینک لگائے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ بھی اب یاد نہیں۔ خیر، تو اس کے بعد اس شخص نے دھیرے سے ہنستے ہوئے میری ٹوکری میں ہاتھ ڈال کے اور چند کھلونوں کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور پھر انہیں دوبارہ سر کے رومال میں باندھ کے لوٹا دیا۔"

لونگرین بیٹی کی باتوں کو غصے سے سن رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ عمدہ چیزوں سے لدے ہوئے کاؤنٹر کے پاس شاندار کپڑوں میں ملبوس افراد کی بھیڑ بھاڑ میں ڈری سہمی اسول کو کھڑا دیکھ رہا ہو۔ صاف ستھرا آدمی جو عینک لگائے ہوئے تھا، بڑے سرپرستانہ انداز میں سمجھا رہا تھا کہ اس نے لونگرین کے کھلونے بیچنے کا فیصلہ کیا تو اس کا دوالا نکل جائے گا۔ اس نے رواروی میں بڑے سلیقے سے اسول کے سامنے کاؤنٹر پر تہ ہو جانے والے مکانات اور ریلوے پل کھڑے کر دئے تھے۔ کھلونوں میں ننھی ننھی، مہارت سے بنی ہوئی موٹرگاڑیاں، بجلی کے سیٹ اور طیارے بھی شامل تھے۔ ان سب سے ان پر چڑھے ہوئے رنگوں اور اسکول کی مہک آ رہی تھی۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ بچے تو اب وہی کھیل کھیلتے ہیں جو ان کے بڑوں کے پیشوں کی نقل ہوتے ہیں۔

پھر اسول «علاؤالدین کا چراغ» نامی دوکان اور دوسری دو دوکانوں پر بھی گئی تھی لیکن کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا تھا۔

اپنی سرگزشت ختم کر کے اسول نے کھانا لگایا۔ لونگرین کھانے کے بعد ایک مگ گھری کافی پی چکا تو اس نے کہا:

"اب جبکہ بدقسمتی سر پر منڈلا رہی ہے، ہمیں کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ شاید میں پھر کسی جہاز پر نوکری کر لوں گا ـــ «فٹزروئے» یا «پالیرمو» پر۔ یقیناً وہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں" اس نے کھلونوں کو یاد کرتے ہوئے

کھوئے کھوئے انداز میں بات جاری رکھی۔ "آج کل بچے کھیلتے نہیں ھیں، پڑھتے ھیں۔ پڑھتے رھتے ھیں، پڑھتے رھتے ھیں اور وہ جینا کبھی بھی نہ شروع کریں گے۔ یہ ھے صورت حال لیکن شرمناک، واقعی بڑی شرمناک صورت حال۔ اچھا تو تم میرے ایک بحری سفر کے دوران کام چلا لوگی؟ میں تو تمہیں اکیلے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر پا رہا ھوں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ ملازمت کر سکتی ھوں۔ مثال کے طور پر شراب‌خانے کی خادمہ کے طور پر۔"

"ھرگز نہیں!" لونگرین نے اپنے الفاظ پر زور دینے کے لئے میز پر اتنے زور سے ھاتھ مارا کہ وہ جھول اٹھی۔ "جب تک میں زندہ ھوں تم نوکری نہ کروگی۔ بہرحال، کچھ سوچ ھی لیں گے، ایسی جلدی بھی کیا۔"

وہ افسردہ خاموشی میں کھو گیا۔ اسول اس کے پاس اسٹول کے کونے پر بیٹھ گئی۔ لونگرین سر کو موڑے بغیر کن‌انکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ بیٹی اسے تسلی دینے کی ھر ممکن کوشش کر رھی ھے اور وہ مسکرانے ھی کو تھا لیکن اس خیال سے ارادہ بدل دیا کہ اس کی مسکراھٹ سے اسول سہم کر اٹھ جائےگی اور خفت محسوس کرنے لگےگی۔ لڑکی نے منہ ھی منہ میں کچھ کہتے ھوئے اپنے الجھے ھوئے بالوں کو درست کیا، باپ کی مونچھیں چوم لیں اور اس کے بال‌دار کانوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی مخروطی انگلیوں سے ڈھکتے ھوئے کہا: "یہ لیجئے، اب تو آپ مجھے یہ کہتے ھوئے بھی نہیں سن سکتے کہ میں آپ سے محبت کرتی ھوں۔" اسول اسے پیار کر رھی تھی تو وہ بالکل بےحس و حرکت، اس شخص کی طرح تناؤ کی حالت میں بیٹھا ھوا تھا جو دھواں نگل لینے سے ڈر رھا ھو لیکن اس کی یہ بات سنتے ھی وہ قہقہہ مار کر ھنس پڑا۔

"میری پیاری" اس نے سادگی سے کہا اور اس کے رخسار کو دھیرے سے تھپتھپا کر اپنی کشتی کو دیکھنے کے لئے ساحل پر چلا گیا۔

اسول ذرا دیر کمرے کے وسط میں کھوئی کھوئی سی کھڑی پس و پیش میں مبتلا رھی کہ کیا کرے۔ ایک طرف تو اس کا جی چاہ رھا تھا کہ خود کو فکروں سے بھری ھوئی اداسی کے حوالے کر دے اور دوسری طرف گھر کے کاموں کو نپٹانا بھی ضروری تھا۔ آخرکار وہ پلیٹیں دھونے کے بعد بچی کھچی غذائی اشیا کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے کسی چیز کو نہ تولا نہ ناپا لیکن دیکھا کہ آٹا پورا ھفتہ بھی نہ کاٹ سکےگا، شکر کے ڈبے کا پیندا نظر آنے لگا ھے، چائے اور کافی کے پیکٹ تقریباً خالی ھو چکے ھیں اور مکھن ختم ھو چکا ھے۔ آلوؤں پر البتہ اس کی نظر ھمدردی ظاھر کرنے کے انداز میں ٹھہر گئی کیونکہ یہی ایک چیز تھی جس کا بورا کا بورا بھرا رکھا تھا۔ پھر اس نے فرش پر پونچھا لگایا اور سائے کی جو کسی اور لباس کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، ایک چنٹ میں پیوند لگانے بیٹھ گئی۔ دوسرے ھی لمحے اسے خیال آیا کہ کپڑوں

کے بچے کھچے ٹکڑے آئینے کے پیچھے لٹکے ہوئے ہیں، جا کے چھوٹی سی پوٹلی نکالی اور اپنا عکس دیکھا۔

اخروٹ کی لکڑی کے فریم کے اندر منعکس کمرے کے صاف خلا میں گلابی پھول‌دار سستے سفید تن‌زیب میں ملبوس چھوٹی سی، چھریرے بدن کی لڑکی موجود تھی۔ بھورے ریشمی رومال نے اس کے شانوں کو ڈھک رکھا تھا۔ دھوپ سے قدرے سونلایا ہوا چہرہ جو اب بھی بچکانہ ھی تھا، شگفتہ اور جذبات کا آئینہ‌دار تھا۔ خوبصورت آنکھیں جو اس کی عمر کے لحاظ سے کچھ زیادہ ھی سنجیدہ تھیں، زود حس افراد سے مخصوص شرمیلے انہماک کے ساتھ دیکھ رھی تھیں۔ اس کا غیرمعمولی چہرہ خط و خال کی لطیف پاکیزگی کی بنا پر بڑا دلکش تھا: یوں تو ھر خم، ھر ابھار بہت سی دوسری عورتوں کے چہروں پر بھی دیکھا جا سکتا تھا لیکن بحیثیت مجموعی چہرے میں بلا کی انفرادیت اور دلربائی پائی جاتی تھی۔ ھمیں اتنے ھی پر اکتفا کرنی چاھئے۔ باقی جو کچھ تھا اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اظہار کے لئے بس ایک ھی لفظ ھے: جادو۔

آئینے والی لڑکی اسول ھی کی جیسی بےچینی سے مسکرائی۔ یہ اداس مسکراھٹ تھی جس سے اسول یوں پریشان ھو اٹھی جیسے کسی اجنبی کو دیکھ رھی ھو۔ اس نے اپنا رخسار آئینے سے چپکا دیا، آنکھیں بند کر لیں اور اپنے عکس پر دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کے ذھن میں ان‌گنت مبہم اور لطیف خیالات کی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ سیدھی کھڑی ھو کے ھنس پڑی اور سلنے بیٹھ گئی۔

جب تک وہ سلائی کر رھی ھے تب تک ھمیں اسے ذرا غور سے دیکھنا چاھئے، ذرا اس کے وجود کے اندر جھانکنا چاھئے۔ وہ دو لڑکیوں سے مل کر بنی تھی، دو اسولیں پرمسرت اور شاندار انداز میں ایک دوسرے میں ضم ھو گئی تھیں۔ ایک تو ملاح، دستکار اور کھلونے ساز کی بیٹی تھی اور دوسری ایک جیتی جاگتی نظم، شاعرانہ خوش ترتیبیوں اور استعاروں کے تمام کمالات کے ساتھ، لفظوں کی پراسرار تصویرکشی کے ساتھ۔ ایک دھوپ تھی دوسری چھاؤں، دونوں ایک دوسرے پر پڑتی اور اثر انداز ھوتی تھیں۔ وہ زندگی کو اپنے تجربات کی حدود ھی میں جانتی پہچانتی تھی لیکن اسے عام باتوں کے علاوہ ایک مختلف نظام کے منعکس مفہوم کو دیکھنا بھی آتا تھا۔ اس طرح ھم مختلف اشیا کو دیکھتے وقت ان کا مشاھدہ خط مستقیم کے تصور سے نہیں بلکہ تاثر کے ذریعے کرتے ھیں جو یقیناً ایک انسانی کیفیت ھے اور ھر انسانی بات کی طرح واضح۔ ھم نے اس مثال سے جس چیز کی وضاحت کی ھے (اگر ھمیں کامیابی نصیب ھوئی ھے) اسی سے ملتی جلتی کسی چیز کو وہ مرئی اشیا سے بلند ھو کر، ان کی حدود سے آگے بڑھ کر دیکھا کرتی تھی۔ ان معمولی معمولی فتوحات کے بغیر وہ سب کچھ جو سیدھے سادے طور پر قابل فہم تھا، اس کے لئے ناقابل فہم ھوتا۔ مطالعے سے اسے بہت دلچسپی تھی لیکن جس طرح وہ زندگی بسر کرتی تھی اسی طرح ھر کتاب

میں زیادہ تر انہی باتوں کا مطالعہ کرتی تھی جو واضح طور پر نہیں لکھی ہوتی تھیں۔ وہ غیرشعوری طور پر کسی الہام کے تحت قدم قدم پر نہایت ھی پراسرار دریافتیں کیا کرتی تھی، ناقابل بیان لیکن صفائی اور حرارت کی جتنی اھم دریافتیں۔ بعض اوقات ــ اور یہ سلسلہ کئی کئی دنوں تک جاری رھتا تھا ــ وہ یکسر بدل بھی جایا کرتی تھی، زندگی کی جسمانی مزاحمت یوں ختم ھو جاتی تھی جیسے ساز کے تاروں پر کمانچہ پھیرتے ھی سناٹا اور اس کے بعد جو کچھ وہ دیکھتی تھی، جو کچھ اس کے لئے بےحد اھم ھوتا تھا، جو اس کے گرد و پیش ھوتا تھا سب کچھ دنیا سے متعلق تصور میں کسی پراسرار جھالر کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سخت تشویش اور خوف میں مبتلا ھو کر رات کے وقت ساحل پر بھی چلی جایا کرتی تھی جہاں پو پھٹنے کا انتظار کرتے ھوئے غور سے سمندر کو تکتی رھتی، ارغوانی بادبانوں والے جہاز کو تلاش کرتی رھتی۔ یہ لمحات اس کے لئے انتہائی پرمسرت ھوتے تھے۔ ھمارے لئے کسی پریوں کی کہانی میں اس طرح کھو کر رہ جانا مشکل ھے لیکن اسول کے لئے اس کہانی کی قوت اور سحر سے خود کو بچائے رکھنا بھی اتنا ھی مشکل ھوتا۔

دوسرے موقعوں پر اس سب کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ اپنے اوپر خلوص دل سے حیرت کرنے لگتی، جن باتوں پر اس نے یقین کیا تھا ان پر یقین نہ کر پاتی، سمندر کو ایک مسکراھٹ کے ساتھ معاف کر دیتی اور ملول و مغموم حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتی۔ اس وقت بھی اپنے سائے کی چنٹ کو درست کرتے ھوئے وہ اپنے ماضی کے بارے میں سوچنے لگی۔ زندگی میں بہت کچھ تھا جسے بےرنگ و بو اور معمولی کہا جا سکتا تھا۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ تنہائی کی اذیت جھیلنا بعض اوقات اس کے لئے بہت صبر آزما ثابت ھوتا تھا لیکن اس کے اندر اس وقت تک باطنی شرمیلےپن کی وہ تہہ، اذیت کی وہ شکن نمودار ھو چکی تھی جو انسان کو خوشی دینے یا خوشی قبول کرنے سے روک دیتی ھے۔ دوسرے لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے، کہتے تھے: "ارے وہ تو سنکی لڑکی ھے"، "اس کا تو دماغ ھی خراب ھے" لیکن وہ اس اذیت کو جھیلنے کی بھی عادی ھو چکی تھی۔ لڑکی کو توھین و تذلیل سے بھی سابقہ پڑتا تھا جس کے بعد اس کا سینہ یوں دکھنے لگتا تھا جیسے کسی نے مکا مار دیا ھو۔ وہ کپرنا میں مقبول لڑکی نہ تھی، بعضوں کو شک البتہ تھا کہ اس میں دوسری لڑکیوں سے کچھ زیادہ ھی کشش ھے لیکن ایک دوسری نوعیت کی۔ کپرنا کے مرد بھرے بھرے اعضا والی گداز عورتوں پر، چکنی جلد کی بڑی بڑی پنڈلیوں اور طاقتور بازوؤں والی عورتوں پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ ان عورتوں سے ان کے کولھوں پر ھاتھ مار کر، بھیڑ بھاڑ والے بازاروں کی دھکا پیل کی طرح انہیں دھکے دے کر محبت جتاتے تھے۔ جذبات کے اظہار کا یہ انداز کسی گرج کی بےتصنع سادگی سے مشابہ ھوتا تھا۔ اسول اس قسم کے ماحول کے لئے اتنی ھی موزوں تھی جتنی کہ کسی بھتنی کی صحبت کے لئے خواہ وہ اسونتا اور اسپاسیا کے سارے حسن و جمال کی مالک ھی کیوں نہ ھو، انتہائی زودحس افراد۔

اسی طرح کسی سپاھی کے بگل کی مسلسل تیز آواز کے مقابلے میں وائیلن کی سریلی اداسی بااصول رجمنٹ کو اس آواز کے اثرات سے باھر نکالنے میں قطعاً بےبس ثابت ھوتی ھے۔ چنانچہ لڑکی نے اپنے ماحول کی ان متذکرہ بالا باتوں سے منہ موڑ لیا تھا۔

اس کے ھونٹوں پر زندگی کا دھیما دھیما سا گیت رقصاں تھا اور چھوٹے چھوٹے ھاتھ تیزی اور بڑی صفائی سے کام کرتے جا رھے تھے۔ کبھی کبھی وہ کسی دھاگے کو دانتوں سے کاٹتے وقت دوسری طرف دیکھنے لگتی تھی لیکن اس وقت بھی کنارے کو سلیقے سے موڑنے یا سلائی مشین کی جیسی درستی سے اس کی ترپائی کرنے کا سلسلہ جاری رھتا تھا۔ لونگرین واپس نہیں لوٹا تھا لیکن وہ باپ کی طرف سے فکرمند نہیں تھی۔ ادھر کچھ دنوں سے تو رات کے وقت اپنی کشتی پر مچھلیوں کے شکار یا بس یوں ھی ھواخوری کے لئے گھر سے نکل کھڑے ھونا لونگرین کا معمول سا بن گیا تھا۔ لیکن اسول پر کبھی بھی خوف نہیں طاری ھوتا تھا، وہ جانتی تھی کہ باپ کا بال بھی بیکا نہ ھوگا۔ اس معاملے میں اسول دراصل اب بھی وھی چھوٹی بچی ھی تھی جو اپنے مخصوص انداز میں عبادت کیا کرتی تھی، پیار سے تتلاتے ھوئے صبح کو "صبح بخیر، پروردگار!" اور شام کو "شام بخیر، پروردگار!" کہا کرتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ قادر مطلق سے اس کا یہ براہ راست رابطہ اس بات کے لئے کافی ھے کہ وہ ھر بلائے ناگہانی سے محفوظ رکھے۔ وہ خدا کا تصور کر کے سوچا کرتی تھی کہ وہ تو ھمہ وقت لاکھوں افراد کے معاملات میں مصروف رھتے ھیں اور اسی لئے یقین کرتی تھی کہ انسان کو زندگی کے معمولی معمولی تاریک پہلوؤں کو اس مہمان کے جیسے شائستہ صبر کے ساتھ برداشت کرنا چاھئے جو گھر میں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر بھاگ دوڑ میں مصروف میزبان کا انتظار کرتا اور کھانے اور سر چھپانے کی جگہ کو اپنے لئے بہترین سمجھتا ھے۔

سلائی پوری کر کے اسول نے سائے کو تہہ کیا، کونے والی میز پر رکھا، کپڑے اتارے اور بستر میں گھس گئی۔ لیمپ بجھایا جا چکا تھا۔ لیکن ذرا ھی دیر میں اسے پتا چلا کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ھے۔ ذھن دوپہر کے وقت ھی کی طرح صاف تھا اور اسے تیرگی تک مصنوعی معلوم ھو رھی تھی۔ ذھن ھی کی طرح اس کا سارا جسم بھی دن ھی کی جیسی تازگی محسوس کر رھا تھا۔ اس کا دل جیب گھڑی کی جیسی تیزی سے معلوم ھوتا تھا کہ تکیے اور اس کے کان کے درمیان دھڑک رھا ھے۔ اسول کو عجب جھلاھٹ سی محسوس ھوئی، وہ کسمسانے اور کروٹیں بدلنے لگی۔ کبھی کمبل کو جسم کے اوپر سے الگ ڈھکیل دیتی اور کبھی اس کے اندر سمٹ کر سر تک ڈھک لیتی۔ آخرکار وہ اپنے ذھن کے پردے پر اس مانوس منظر کو نمودار کرنے میں کامیاب ھو گئی جس نے سونے میں مدد کی۔ اس نے تصور کیا وہ صاف و شفاف پانی پر کنکر پھینک پھینک کر ننھے ننھے دائروں کو وسیع سے وسیع تر ھوتے دیکھ رھی ھے۔ نیند تو جیسے اسی تحفے ھی کی منتظر تھی، اس نے دبے پاؤں آ کے سرھانے کھڑی

مقدس مریم سے سرگوشی کی اور ان کی مسکراهٹ کے اشارے پر عمل کرتے هوئے ارد گرد کی هر شے سے خاموش هونے کے لئے "هش" کہا۔ اسول فوراً هی سو گئی اور اپنا محبوب خواب دیکھا جو پھولتے هوئے درختوں، دلی آرزوؤں، جادو، گیتوں اور عجیب و غریب مناظر پر مشتمل تھا۔ بیدار هونے پر اسے ان مناظر میں سے صرف اُس نیلگوں پانی کی چمک هی یاد رہ گئی جو اس کے قدموں سے ابھر کے دل تک جا پہنچا تھا۔ خواب میں یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ اس بعید از قیاس دنیا میں مزید کچھ دیر تک کھوئی رهی اس کے بعد پوری طرح بیدار هو کے اٹھ بیٹھی۔

اس پر نیند کا ذرا بھی اثر باقی نہ تھا جیسے سرے سے سوئی هی نہ هو۔ ندرت، مسرت اور کچھ کر گزرنے کی خواهش اسے اپنے اندر ابلتی هوئی محسوس هوئی۔ اس نے گرد و پیش کو کسی نئے کمرے کا جائزہ لینے والے کی نظروں سے دیکھا۔ سویرا اندر داخل هوا لیکن اپنی تابانیوں کے ساتھ نہیں بلکه ایسا دھندلکا لئے هوئے جس میں انسان اپنے ماحول کو پہچان سکتا هے۔ کھڑکی کا نچلا حصہ تاریک جبکه اوپری حصہ روشن تھا۔ باهر، کھڑکی کے چوکھٹے کے قریب هی ستارہ سحر ٹمٹما رها تھا۔ اسول کو معلوم تھا که اب سو جانے کا کوئی سوال نہیں اس لئے اس نے کپڑے پہنے، کھڑکی کے پاس گئی اور هک نکال کے اسے کھولا۔ باهر گہری خاموشی کی حکمرانی تھی جو لگتا تھا کہ اب کہیں جا کر دھرتی پر پوری طرح اتری هے۔ نیلگوں جھٹپٹے میں جھاڑیاں چمک رهی تھیں، ان سے آگے بڑھ کے درخت کھڑے کھڑے اونگھ رهے تھے، فضا بوجھل تھی اور اس میں مٹی کی مہک بسی هوئی تھی۔

لڑکی نے کھڑکی کے چوکھٹے کو تھام کے باهر جھانکا اور مسکرا دی۔ اچانک کسی دور کی پکار سے ملتی جلتی کسی شے نے اس کی روح اور جسم میں عجب جوش و خروش پیدا کر دیا اور اسے ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ بیدار هو کر، کھلی هوئی حقیقت سے آگے بڑھ کر اس سے زیادہ واضح، شکوک سے کہیں زیادہ پاک و صاف فضا میں آ گئی۔ اس لمحے کے بعد سے پھر وہ احساس کی شدید لطافت هی سے سرشار رهی۔ اس طرح سے هم دوسروں کے کہے هوئے الفاظ کو سمجھتے هوئے سنتے هیں لیکن جو کچھ کہا گیا تھا اس کی اگر تکرار کی جائے تو هم انهی الفاظ کو ایک بار پھر سمجھیں گے، مختلف اور نئے معنوں کے ساتھ۔ اسول کو بھی اس وقت یهی تجربه هوا۔

اس نے ایک پرانے رومال کے جو اس کے سر پر اوڑھتے هی بالکل نیا چمکیلا ریشمی رومال معلوم هونے لگا، دونوں سرے اپنی ٹھوڑی کے نیچے ایک هاتھ سے پکڑے، دروازے کو مقفل کیا اور ننگے پاؤں سڑک پر نکل آئی۔ سارا ماحول سنسان اور خاموش تھا لیکن اس نے تصور کیا که وہ آرکسٹرا کی طرح آواز پیدا کر رهی هے اور اسے واقعی سنا جا سکتا هے۔ هر شے اسے مسرور کر رهی تھی، اس کی آنکھوں کو فرحت بخش رهی تھی۔ گرم گرم سی دھول اس کے ننگے پیروں کو گدگدا رهی تھی، هوا اتنی صاف تھی که اس میں سانس لینا باعث مسرت تھا۔ آسمان کے صاف هوتے هوئے دھندلکے

کے پس‌منظر میں مکانوں کی چھتیں اور بادل کالے کالے نظر آ رہے تھے۔ جنگلے، جنگلی گلاب کی جھاڑیاں، چمن، پھلوں کے باغ اور دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہوئی سڑک — ہر شے اونگھ رہی تھی۔ ہر شے میں دن کی بہ‌نسبت نمایاں طور پر مختلف آراستگی پائی جاتی تھی — تھا تو سب کچھ وہی لیکن ایسی ترتیب اور سلیقے کے ساتھ جسے دن کے وقت نگاھیں نہیں دیکھ پاتی تھیں۔ ہر شے آنکھیں کھولے ہوئے سو رہی تھی، گزرتی ہوئی لڑکی کا چوری چھپے جائزہ لے رہی تھی۔

کچھ دور جا کے اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ گاؤں سے جلد از جلد باھر نکل جائے۔ کپرنا کے آگے سبزہ‌زار تھے اور سبزہ‌زاروں کے آگے سمندر کے کنارے کنارے واقع پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر ھیزل کی جھاڑیاں اور پاپلر اور شاہ‌بلوط کے درخت۔ سڑک جس جگہ پر ختم ہو کے گھاس سے ڈھکے ہوئے راستے میں تبدیل ہو گئی تھی وھاں چکنے چکنے بالوں والے چھوٹے سے ایک کتے نے جس کا سینہ سفید تھا اور آنکھیں کچھ کہنے کے لئے بےتاب، محبت کے ساتھ اسول کے قدموں کا چکر لگایا۔ کتے نے اسول کو پہچان لیا اور اس کے پہلو میں چلنے لگا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھیرے سے بھونکتا، اپنے جسم کو شوخی کے ساتھ بل دیتا اور کسی ایسی شے کے متعلق لڑکی کے خیال کی خاموشی سے تائید کرتا جا رہا تھا جو اتنی ھی حقیقی تھی جتنی کہ "تو" اور "میں" اسول کو کتے کی بہت کچھ کہتی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر یقین ہو گیا کہ خاموش رھنے کی کوئی خفیہ وجہ نہ ہوتی تو وہ ضرور باتیں کرنے لگتا۔ کتے نے اسول کے چہرے پر تبسم کی جھلک دیکھی تو خوش ہو کے اپنی ناک پر شکنیں ڈالیں، دم ھلائی اور دوڑ کے کچھ آگے نکل گیا لیکن لڑکی کو نظرانداز کرکے اچانک بیٹھتے ہوئے اپنے کان کو جسے اس کے مستقل دشمن نے ڈس لیا تھا، کھجلایا اور وھاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اسول لمبی لمبی گھاسوں میں داخل ہوئی جنھوں نے اس پر شبنم برسا دی۔ اس نے اپنا ھاتھ گھاس کی پھولی ہوئی بالیوں کے اوپر اٹھا لیا اور ھتھیلی سے ان کے سرسراتے ہوئے لمس کو محسوس کرتی، مسکراتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اسے پھولوں کے انتہائی غیرمعمولی چہروں اور ڈنٹھلوں کے الجھاؤ کو دیکھ دیکھ کر تشبیہات سوجھ رھی تھیں، ان کے مختلف انداز، کوششیں، حرکات، شکل صورت اور تاثرات تقریباً انسانی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اب جنگلی چوھوں کے کسی جلوس، گوفروں کے کسی مشترکہ رقص یا خوابیدہ بدروح کو اپنے غصے سے خوف‌زدہ کر دینے والی کسی ساھی کی وحشیانہ اچھل کود پر متحیر نہیں ہو سکتی تھی۔ دراصل ایک گول مٹول ساھی اسول کا راستہ بھی کاٹ گئی، یہ غصے سے یوں غرا رھی تھی جیسے کوئی بگھی والا راہ‌گیروں کو الگ ھٹانے کے لئے چلا رھا ہو۔ اسول نے جنہیں دیکھا سمجھا ان سے باتیں بھی کیں۔ "کہو، میرے تباہ حال" اس نے ایک اودے اودے کرم خوردہ پودے سے کہا۔ "ارے تم تو کچھ روز گھر میں ھی رہو" — یہ مشورہ اس نے راستے میں پھنسی ہوئی

ایک جھاڑی کو دیا جس کی پتیاں راہ‌گیروں کے کپڑوں سے رگڑ کھا کھا کے غائب ہو چکی تھیں۔ ایک بڑا سا بھونرا گھنٹی جیسے نیلے پھول سے چمٹا ہوا تھا، وہ اسے گھسیٹ کے نیچے کرتا، خود پھسل جاتا لیکن دوبارہ ضدی پن کے ساتھ اوپر آ جاتا تھا۔
"ارے اس موٹے مسافر کو جھٹک کے گرا بھی دو" اسول نے پھول کو مشورہ دیا۔ اور ہوا بھی یہی، بھونرا پھول پر ٹھہر نہ سکا اور بھنبھناتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس طرح تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل اور تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ ہانپتی کانپتی ایک پہاڑی کی ڈھلان کے قریب پہنچی اور گھاس کے کھلے میدان سے آگے بڑھ کے گھنی جھاڑیوں میں داخل ہو گئی۔ وہاں سچے دوستوں نے اسے گھیر لیا جو جیسا کہ وہ بخوبی جانتی تھی، نیچی آوازوں میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

یہ بڑے بڑے پرانے درخت تھے جو زرد خوشبودار پھولوں کی بیلوں اور ہیزل کی جھاڑیوں کے بیچ بیچ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی جھکی ہوئی شاخیں جھاڑیوں کی اوپری پتیوں کو سہلا رہی تھیں۔ شاہ‌بلوط کے بڑے بڑے پتوں کی گمبھیر خاموشی کے درمیان سفید پھولدار پھل جھانک رہے تھے جن کی مہک میں شبنم اور رس کی خوشبوئیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ راستہ جس میں جگہ جگہ درختوں کی پھسلن دار جڑیں ابھری ہوئی تھیں، کبھی نشیب میں چلا جاتا تھا تو کبھی ڈھلان پر چڑھنے لگتا تھا۔ اسول کو اس ماحول میں گھر کا جیسا آرام و سکون محسوس ہوا، اس نے درختوں کے چوڑے چوڑے پتوں کو دبا دبا کر ان سے یوں صاحب سلامت کی جیسے کہ وہ انسان ہوں۔ وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی، دل ھی دل میں یا بہ‌آواز بلند کہتی جا رہی تھی:
"یہ رہے۔ تم اور یہ بھی تمہی ہو۔ کتنی زیادہ ھے تمہاری تعداد، میرے دوستو! سنو، میں ذرا عجلت میں ہوں، لڑکو، مجھے گزر جانے دو! میں تم سب کو پہچان رہی ہوں، تم سب کے سب مجھے یاد ہو، میں تمہارا احترام کرتی ہوں۔" جواب میں اس کے "لڑکوں" نے حتی‌الامکان شاندار انداز سے اس کے شانے تھپتھپائے — اپنی پتیوں سے — اور روحانی رشتے کے احساس کے ساتھ چرمرا اٹھے۔ کیچڑ میں لت پت پیروں کے ساتھ وہ درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سطح سمندر سے بلند راس پر پہنچی اور اس کے بالکل کنارے کھڑی ہو کر ھانپنے لگی کیونکہ بہت تیزی سے چلتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔ اس وقت اس کے سینے میں ایک گہرا، ناقابل تسخیر اعتقاد مسرت اور فخر کے ساتھ کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کی نگاھوں نے اس اعتقاد کو افق کے آگے تک پہنچا دیا جہاں سے یہ ساحل کی طرف آتی ہوئی نہایت ھی ھلکی ھلکی لہروں کے ساتھ، اپنی شاندار پرواز پر فخر کرتا ہوا واپس لوٹ آیا۔

سمندر جو افق کے کنارے کنارے کسی سنہرے دھاگے سے سلا ہوا معلوم ہوتا تھا، اب بھی محو خواب تھا۔ صرف راس کے قریب ھی پانی اوپر اٹھ اٹھ کے نیچے آ رہا تھا۔ ساحل پر خوابیدہ سمندر کا گہرے خاکستری رنگ کا پانی نیلا اور اس سے کچھ اور آگے بڑھ کے سیاہ ہو گیا۔ سنہرے دھاگے سے کچھ آگے آسمان پر آگ سی بھڑک

اٹھی اور روشنی کا زبردست گولا سا چمکنے لگا۔ سفید بادلوں پر ہلکا ہلکا گلابی رنگ نمودار ہوا اور ان کے اندر یہ نفیس گلابی ٹکڑے خوبصورتی سے جھلملانے لگے۔ دور، سیاہی کے آر پار تھرتھراتی ہوئی، برف جیسی سفیدی پھیل گئی۔ جھاگ سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں اور سنہرے دھاگے کے کنارے کنارے دوڑ جانے والی خون جیسی سرخی سے نکل کر ہلکی ہلکی ارغوانی لہریں سمندر کو پار کرتی ہوئی اسول کے قدموں تک آ گئیں۔

اس نے بیٹھ کر اپنے گھٹنوں کو بانہوں میں جکڑ لیا اور سمندر کی طرف جھک کر افق کو ایسی آنکھوں سے تکنے لگی جو بڑی بڑی ہو گئی تھیں لیکن ان میں بڑوں کی جیسی کوئی بات باقی نہیں رہ گئی تھی — وہ کسی بچے کی آنکھوں سے تک رہی تھی۔ وھاں، دنیا کے سرے پر ہر وہ شے جس کا اس نے اتنی طویل مدت تک، اتنے شوق کے ساتھ انتظار کیا تھا، وجود میں آ رہی تھی۔ اتھاہ گہرائیوں کی اس سرزمین میں اسول نے سمندر کے نیچے واقع ایک پہاڑی کا تصور کیا۔ اس پہاڑی کی ڈھلانوں پر سے بحری پودے لہراتے بل کھاتے ہوئے اوپر کی طرف اٹھ رہے تھے اور گول گول پتیوں کے درمیان عجیب و غریب پھول چمک رہے تھے۔ اوپری پتیاں سطح سمندر پر دمک رہی تھیں۔ جس شخص کو وہ سب نہ معلوم ہوتا جو اسول کو معلوم تھا اسے صرف ہلکی اور تیز چمک ہی نظر آتی۔

بحری پودوں سے ایک جہاز ابھر کر سطح آب پر آیا اور افق کے بالکل وسط میں جہاں آفتاب طلوع ہو رہا تھا، ٹھہر گیا۔ اتنے زیادہ طویل فاصلے سے بھی وہ جہاز بادلوں کی طرح صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ اس سے مسرت پھیل رہی تھی اور وہ شراب، گلاب کے پھول، خون، ہونٹوں، سرخ مخمل اور دھکتی ہوئی آگ کی طرح چمک رہا تھا۔ جہاز سیدھا اسول ہی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے پیندے کے زبردست قوت کے ساتھ آگے بڑھنے سے دونوں جانب پانی کی پھواریں ابھر رہی تھیں۔ لڑکی نے اپنے دونوں ھاتھ سینے پر رکھ لئے لیکن روشنی کا یہ جادوئی کھیل ہلکوروں میں بدل گیا: آفتاب طلوع ہوا اور صبح کی تابندہ قوت نے ہر اس شے پر سے پردے ہٹا دئے جو اونگھتی ہوئی دھرتی پر اب بھی لیٹی ہوئی آرام کر رہی تھی۔

اسول نے ٹھنڈی سانس بھر کے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ موسیقی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی کھنکتی ہوئی آواز نے لڑکی پر اب بھی جادو کر رکھا تھا۔ یہ تاثر لمحہ بہ لمحہ کمزور پڑتا گیا پھر صرف ایک یاد اور آخر میں محض تھکن بن کر رہ گیا۔ وہ گھاس پر لیٹ گئی، جمائی لی، مسرت کے ساتھ آنکھیں بند کیں اور سو گئی، اس نوجوان لاابالی شخص کی جیسی گہری نیند سے سو گئی جس کے نہ کوئی خواب ہو نہ فکریں۔

اسے ایک مکھی نے جو اس کے ننگے تلوے پر رینگ رہی تھی، بیدار کیا۔ اسول نے بےصبری کے ساتھ پاؤں کو ادھر ادھر موڑا اور آخرکار جاگ کے اٹھ بیٹھی۔ وہ اپنے

الجھے ہوئے بالوں کو پیچھے کر کے پن لگانے لگی تو گرے کی انگوٹھی نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا لیکن اسول نے اس یقین کے ساتھ اپنی انگلیاں پھیلا دیں کہ ان میں گھاس کا کوئی تنکا پھنس گیا ہوگا۔ اس طرح بھی رکاوٹ دور نہ ہوئی تو اس نے ہاتھ کو اٹھا کے آنکھوں کے سامنے کیا اور فوراً ہی فوارے سے اچھلتی ہوئی دھار کی تیزی سے اچھل کے کھڑی ہو گئی۔

گرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں یوں چمک رہی تھی جیسے کسی دوسرے کی انگلی میں ہو۔ دراصل اس لمحے وہ اس انگوٹھی کو خود اپنی نہیں کہہ سکتی تھی اسی لئے وہ یہ بھی نہیں محسوس کر رہی تھی کہ انگلی اسی کی ہے۔ "یہ انگوٹھی کس کی ہے؟ آخر یہ مذاق کس کو سوجھا؟" وہ چیخ اٹھی۔ "کیا میں اب بھی سو رہی ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مجھے پڑی ملی ہو اور میں بھول گئی ہوں؟"

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو جس میں انگوٹھی تھی، بائیں ہاتھ سے زور سے پکڑ کے حیرت کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا، سمندر اور شاداب جھاڑیوں پر نظریں دوڑائیں لیکن کسی کی آہٹ نہ سنائی دی۔ گھنی جھاڑیوں میں کوئی بھی نہیں چھپا ہوا تھا اور منور نیلگوں سمندر میں بھی کہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک جذبات کی شدت نے اسول کو آگ کی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کے دل کی آوازوں نے پیش گوئی کے انداز میں چپکے سے "ہاں" کہہ دیا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی کوئی توضیح نہ تھی لیکن اسے اسول نے کچھ سوچے یا کہے بغیر اپنے عجیب و غریب جذبات میں تلاش کر لیا اور انگوٹھی اس کے لئے بہت اہمیت اختیار کر گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے اسے انگلی سے اتارا اور پیالے کی طرح سمٹے ہوئے ہاتھ میں پانی کی طرح رکھ کر جائزہ لینے لگی — اپنی روح اور دل کے ذریعے، بےکراں مسرت اور نوجوانی کے واضح توہم کے ذریعے۔ پھر اس نے انگوٹھی کو چولی کے اندر رکھ کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا جن کے نیچے سے مسکراہٹ باھر نکل پڑنے کو بےتاب تھی۔ آخر وہ سر جھکائے ہوئے دھیرے دھیرے گھر کی طرف گامزن ہو گئی۔

تو یوں جیسا کہ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے افراد کہتے ہیں، محض اتفاقاً ہی گرے اور اسول نے گرمیوں کی ایک صبح کو جو پکار پکار کے کہہ رہی تھی کہ ہونے والی بات ہو کر رہےگی، ایک دوسرے کو پا لیا۔

۵

لڑائی کی تیاری

گرے اپنے جہاز "سیکریٹ" کے عرشے پر واپس لوٹنے کے بعد ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑا سر پر پیچھے سے آگے کی طرف ہاتھ پھیرتا رہا جو اس کے سخت الجھن میں مبتلا ہونے کی علامت تھی۔ بےخیالی — جذبات کی ایک درپردہ حرکت — نیند میں چلنے والے

کی اس مہمل مسکراہٹ سے جھلک رہی تھی جو اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نائب پینٹن اسی وقت تلی ہوئی مچھلی کی پلیٹ لئے وسطی عرشے پر چلا آ رہا تھا۔ اس نے گرے کو دیکھتے ہی کپتان کی عجیب و غریب حالت کو بھانپ لیا۔

"آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں لگی، جناب عالی؟" اس نے محتاط انداز سے پوچھا۔ "آپ تھے کہاں؟ کیا دیکھ آئے؟ ویسے تو درحقیقت مجھے اس سب سے سروکار نہ ہونا چاہئے۔ ہاں، ایک ایجنٹ نے ہمیں ایک کھیپ مال لاد کر لے جانے کی منفعت بخش پیش‌کش کی ہے، بونس کے ساتھ۔ لیکن آخر آپ کو ہوا کیا، جناب عالی؟"

"شکریہ" گرے نے یوں ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا جیسے وہ رسیوں سے بندھا تھا جنہیں کھول دیا گیا ہے۔ "مجھے آپ کی سیدھی سادی، تیز آواز کو سننے ہی کی ضرورت تھی۔ یہ سرد پانی کی پھوار ثابت ہوئی۔ ملاحوں سے کہہ دیجئے کہ ہم لوگ آج لنگر اٹھا کر دریائے لیلیانا کے دھانے کو منتقل ہو رہے ہیں جو یہاں سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ہے۔ دریا جگہ جگہ اتھلا ہے اور رتیلے ٹکڑے اوپر تک ابھرے ہوئے ہیں۔ نقشہ دیکھ لیجئے۔ ہمیں راستہ دکھانے والے کی ضرورت نہ ہوگی۔ فی‌الحال بس اتنا ہی کافی ہے... اور ہاں، مجھے اس منفعت بخش مال کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ گزشتہ سال کی برف کی۔ آپ ایجنٹ کو بتا سکتے ہیں کہ میں نے یہی جواب دیا ہے۔ اب میں شہر جا رہا ہوں اور شام تک وہیں رہوں‌گا۔"

"لیکن آخر ہوا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوا، پینٹن۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری اس خواہش کو ذہن میں رکھیں کہ سوالات نہ دریافت کئے جائیں۔ وقت آنے پر میں آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دوں‌گا۔ ملاحوں سے کہہ دیجئے کہ ہم لوگ جہاز کی مرمت کے لئے ٹھہریں‌گے اور مقامی خشک گودی میں جگہ نہیں ہے۔"

"بہت اچھا، جناب" پینٹن نے گرے سے جو مڑ کے وہاں سے چل دیا تھا، بدحواسی کے ساتھ کہا۔ "اچھا اچھا، جناب۔"

کپتان کی ہدایات بڑی معقول تھیں پھر بھی اس کے نائب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ مچھلی کی پلیٹ سنبھالے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا اپنے کیبن کی طرف لپکا: "تم حیرت میں پڑ گئے ہو، پینٹن۔ ہمارے کپتان کو اسمگلنگ میں قسمت آزمائی کی سوجھی ہے کیا؟ کیا اب ہم اپنے جہاز پر بحری قزاقوں کا پرچم لہرائیں‌گے؟" پینٹن کو انتہائی بے‌سر و پا قیاس‌آرائیوں نے بالکل بوکھلا دیا اور وہ گھبراہٹ کے ساتھ مچھلی کو ہڑپ کرنے لگا۔ اس اثنا میں گرے نے اپنے کیبن میں جا کے کچھ رقم لی اور کھاڑی کو پار کر کے لیس کے تجارتی مرکز میں پہنچ گیا۔

اب وہ بڑے عزم اور ٹھنڈے دل سے کام کر رہا تھا، اس شاندار سفر پر اسے جو کچھ کرنا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک اسے معلوم تھیں۔ خیال اور عمل کی ایک ایک جنبش اسے یوں حرارت بخش رہی تھی جیسے وہ تخلیقی کام کی لطیف

مسرت ہو۔ اس نے فوراً ہی ایک واضح منصوبہ مرتب کر لیا۔ زندگی سے متعلق اس کا شعور چھینی کی اس آخری ضرب کو جھیل چکا تھا جس کے بعد سنگ مرمر اپنی شاندار آب و تاب میں پرسکون نظر آنے لگتا ہے۔

گرے نے تین دوکانیں دیکھیں اور اپنے انتخاب کے بالکل درست ہونے پر خاص طور سے زور دیا کیونکہ اسے یہ تک معلوم تھا کہ رنگ کتنا ہلکا یا گہرا ہونا چاہئے۔ پہلی دونوں دوکانوں میں تو اسے بڑے شوخ رنگوں کے ریشمی کپڑے دکھائے گئے جو صرف اناڑیوں ہی کی پسند پر پورے اتر سکتے تھے۔ تیسری دوکان میں البتہ اسے ایسے کپڑوں کے نمونے دیکھنے کو ملے جن کے رنگوں سے جدت و ندرت جھلکتی تھی۔ دوکان‌دار بڑی خندہ پیشانی سے جلدی جلدی اپنے ذخیرے سے مختلف کپڑے نکال نکال کے اس کے سامنے پھیلاتا جا رہا تھا لیکن گرے کے چہرے پر کسی تشریح‌داں کی جیسی سنجیدگی چھپائی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے صبر و سکون سے بنڈلوں اور تھانوں کو لا لا کے ایک طرف رکھا، انہیں ساتھ ساتھ آگے بڑھایا اور کھول کھول کے اتنے زیادہ قرمزی کپڑوں کو روشنی میں لایا کہ لگتا تھا کاؤنٹر جس پر ان کپڑوں کا انبار سا لگ گیا تھا، الاؤ کی طرح بھڑک اٹھے‌گا۔ گرے کے لانگ بوٹ کی نوک پر گہری سرخ لہر سی دوڑ گئی، ہاتھوں اور چہرے پر گلابی عکس چمکنے لگا۔ اس کی انگلیاں نرم نرم ریشمی کپڑوں کو الٹ پلٹ رہی تھیں تو اس کی توجہ رنگوں پر مبذول ہو گئی: ہلکے سرخ، گلابی، گہرے سرخ، تیز بھڑکیلے سرخ، نارنجی اور سیاہی مائل سرخ، ہلکے، گہرے، دھیمے، تیز طرح طرح کے روپ یہاں موجود تھے جو اپنی خیالی قرابت میں بس اتنے ہی مختلف تھے جتنے کہ یہ الفاظ: "دلآویز"، "حیرت انگیز"، "شاندار"، "نفیس"۔ کپڑوں کی تہوں میں زبان بصارت کے لئے ناقابل رسائی اشارے کنائے مضمر تھے لیکن حقیقی ارغوانی رنگ کافی دیر تک ہمارے کپتان کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ دوکان‌دار نے جو کپڑے اسے دکھائے وہ یقیناً اچھے تھے لیکن واضح اور زوردار "ہاں" کہلوانے میں ناکام رہے۔ آخرکار ایک رنگ نے خریدار کو مکمل طور پر مسحور کر دیا۔ اس نے کھڑکی کے قریب ہتھے دار کرسی پر بیٹھ کر سرسراتے ہوئے تھان کی ایک لمبی سی پٹی کھینچی، اسے اپنے گھٹنوں پر پھیلایا، دانتوں میں پائپ دبائے دبائے کرسی کے عقبی حصے سے ٹیک لگائی اور خیالوں میں کھو کر بت سا بن گیا۔

صبح کی کسی ارغوانی شعاع جیسا خالص اور نیک مسرت اور شاہانہ تمکنت سے بھرا ہوا یہ رنگ بالکل وہی شاندار رنگ تھا جس کی گرے کو تلاش تھی۔ اس میں نہ آگ اور پوست کی پنکھڑیوں کے ملے جلے شیڈ تھے نہ بنفشئی اور اودے رنگوں کی مختلف شکلوں کی جھلک، کسی قسم کی نیلاہٹ اور چھاؤں بھی نہ تھی ــ ایسا کچھ بھی نہ تھا جو شک پیدا کرتا۔ یہ رنگ تو کسی تبسم کی طرح روحانی تفکر کی دلآویزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گرے خیالوں میں ایسا کھو گیا کہ اپنی کہنی کے پاس شکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتے کی جیسی چوکسی سے کھڑے ہوئے دوکان‌دار کو بھول

ھی بیٹھا۔ تاجر انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے کپڑے کے ایک ٹکڑے کو پھاڑ کر آواز پیدا کرتے ہوئے اپنی طرف توجہ مبذول کرائی۔

"یہ نمونے کافی ھیں" گرے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں یہ ریشم خرید رہا ہوں۔"

"پورا تھان؟" دوکان‌دار نے مہذب انداز سے شک کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن گرے خاموشی سے اس کی پیشانی کو تکنے لگا جس سے تاجر کو نازیبا بےتکلفی پر اتر آنے کا حوصلہ ملا۔ "اچھا تو پھر کتنے میٹر؟"

گرے نے سر ہلایا جیسے انتظار کرنے کو کہہ رہا ہو اور پھر ایک کاغذ پر پنسل سے حساب لگایا کہ اسے کتنی رقم ادا کرنی ہوگی۔

"دو ہزار میٹر۔" اس نے شک بھری نظروں سے دیواری الماریوں کا جائزہ لیا۔ "ہاں، دو ہزار میٹر سے زیادہ نہیں۔"

"دو؟" دوکان‌دار نے یوں اچھلتے ہوئے پوچھا جیسے بچوں کے کھلونے کا ڈھکن کھلتے ہی مورت نکل پڑتی ہے۔ "ہزار؟ میٹر؟ مہربانی کر کے تشریف رکھئے، کپتان صاحب۔ آپ ہمارے کچھ تازہ ترین نمونے ملاحظہ فرمائیں‌گے؟ جیسی آپ کی مرضی۔ ماچس اور شاندار تمباکو حاضر کروں؟ دو ہزار... دو ہزار، فی میٹر..." اور اس نے جو قیمت بتائی وہ اصلی قیمت سے اتنا ہی تعلق رکھتی تھی جتنا کہ کسی قسم کا سیدھی سادی "ہاں" سے ہوتا ہے لیکن گرے مطمئن ہو گیا کیونکہ وہ کسی بات پر سودےبازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ "شاندار، بہترین ریشم" دوکان‌دار کہہ رہا تھا، "اپنی عمدگی میں لاجواب ہے، لاجواب۔ یہ تو آپ کو بس یہیں مل سکتا ہے اور کہیں بھی نہیں۔"

آخرکار جب اس شخص کے ستائشی الفاظ کا خزانہ ختم ہو گیا تو گرے نے قیمت اور ریشم کے جہاز پر پہنچائے جانے کی اجرت ادا کی اور چل دیا۔ دوکان‌دار نے دروازے تک جا کر اسے کچھ اس شان سے رخصت کیا جیسے وہ چینی شہنشاہ ہو۔ اس اثنا میں کہیں قریب ہی سڑک کے کسی سازندے نے اپنے وائلن چیلو پر دھیرے دھیرے کمانچے کو پھیر پھیر کر اداس اور لطیف نغمے بکھیرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ساتھی نے نواز تاروں کے نغموں پر حلق سے نکلتی ہوئی سیٹیوں کی کھنکتی ہوئی آوازیں نچھاور کر رہا تھا۔ سیدھا سادا گیت جس سے ان دونوں نے دھوپ میں اونگھتے ہوئے احاطے کی فضا کو معمور کر دیا تھا، گرے کے کانوں تک پہنچا اور اسے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ کیا کرنا ہے۔ دراصل ان دنوں میں روحانی بصارت کی جن بلندیوں پر وہ پرواز کرتا رہا تھا وہاں سے حقائق کی پیدا کردہ ہر تحریک کو، ہر اشارے کو واضح طور پر سمجھ لیتا تھا۔ ان آوازوں کو جو گزرتی ہوئی گاڑیوں کے شور میں دب کر رہ گئیں، سنتے ہی وہ ان اہم ترین تاثرات اور خیالات کی تہہ تک پہنچ گیا جو اس کے مخصوص مزاج کی بنا پر موسیقی نے اس کے دل میں بیدار کر دئے تھے، پہلے

ہی سے سمجھ گیا کہ جو کچھ اس نے سوچا تھا وہ کیوں اور کیسے خوش انجام ثابت ہوگا۔ گرے گلی کو پار کر کے اس مکان کے پھاٹک میں داخل ہو گیا جہاں سے سازوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اب سازندے وہاں سے چلے آنے ہی کو تھے، طویل قامت نے نواز پروقار انداز میں جھک کے احسان مندی کے جذبے کے اظہار کے طور پر اُن کھڑکیوں کی طرف اپنی ہیٹ ہلا رہا تھا جہاں سے ان لوگوں کے لئے سکے پھینکے گئے تھے۔ وائلن چیلو کو اس کے مالک نے ایک بار پھر بغل میں دبا لیا تھا اور اب پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے نے نواز کا انتظار کر رہا تھا۔

"ارے یہ تم ہو، زیمر!" گرے نے وائلن‌نواز کو جو شراب‌خانے میں شاموں کو اپنی شاندار موسیقی سے ملاحوں کو محظوظ کیا کرتا تھا، پہچانتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے اپنے وائلن کو کیوں بالائے طاق رکھ دیا؟"

"عزیز کپتان" زیمر نے مطمئن لہجے میں اعتراض کیا۔ "میرا کیا ہے، ہر وہ چیز بجا لیتا ہوں جس سے آواز اور کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو۔ نوجوانی میں تو موسیقی کے میدان میں محض مسخرا ہی تھا لیکن اب مجھے فن سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے اور بڑی افسردگی کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے حقیقی صلاحیت کا گلا گھونٹ دیا۔ یہی وجہ ہے اب تاخیر سے پیدا ہونے والی حرص کے ساتھ وائلن چیلو اور وائلن دونوں سے عشق کرتا ہوں۔ دن میں تو وائلن چیلو بجاتا ہوں اور شام کو وائلن یعنی یہ کہ شام کو روتا ہوا، اپنی کھوئی ہوئی صلاحیت کا ماتم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہوں۔ مجھے آپ کچھ شراب پیش کر سکیں‌گے؟ بولئے نا؟ وائلن چیلو میری کارمین ہے لیکن وائلن..."

"اسول ہے" گرے بول پڑا۔

زیمر کو غلط فہمی ہوئی۔

"جی ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا، "جھانج یا پیتل کی نے پر سولو بجانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ لیکن مجھے اس کی فکر کیوں ہو؟ فن کے مسخروں کو منہ بنانے دیجئے، میں تو جانتا ہوں کہ وائلن چیلو اور وائلن کے اندر پریاں رہتی ہیں۔"

"اور میری تور-ی-لو میں کیا رہتا ہے؟" نے نواز نے ان دونوں کے پاس آتے ہوئے پوچھا۔ وہ بھیڑ کی جیسی نیلی آنکھوں اور گھنگرالی سنہری داڑھی والا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ "اب یہ بتائیے۔"

"یہ تو اس پر منحصر ہوتا ہے کہ صبح سے تم کتنی پی چکے ہو۔ کبھی تو یہ کوئی چڑیا ہوتی ہے اور کبھی شراب کا جھاگ۔ کپتان، میں آپ سے اپنے ساتھی ڈوس کا تعارف کرا سکتا ہوں؟ میں نے ان سے ذکر کیا تھا کہ آپ پینے پلانے پر آ جاتے ہیں تو پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں اور تبھی سے انہیں آپ سے عشق ہو گیا ہے، دیکھے بغیر ہی۔"

"جی ہاں" ڈوس نے کہا، "میں خوش کرنے والے شاندار اقدامات اور فیاضی

کو بہت پسند کرتا ہوں۔ لیکن میں ذرا عیار قسم کا آدمی ہوں اس لئے میری گھٹیا چاپلوسی پر بھروسا نہ کیجئے۔"

"اچھا تو سنو" گرے نے ہنستے ہوئے کہا، "میرے پاس وقت بہت کم ہے اور معاملہ فوری توجہ کا طالب۔ میں تم لوگوں کو معقول رقم کمانے کے ایک موقعے کی پیش‌کش کر سکتا ہوں۔ ایک آرکسٹرا کا انتظام کر لو لیکن اسے جنازے کے شرکا جیسے چہروں والے ان خود نما افراد پر مشتمل نہ ہونا چاہئے جو مہارت کی دھونس جمانے یا اس سے بھی بدتر یہ کہ شکم پروری کے چکر میں موسیقی کی روح کو ہی بھولے بیٹھے ہیں اور اپنے پیچ در پیچ غل غپاڑے سے اسٹیج پر دھیرے دھیرے تابوت کی چادر پھیلاتے جا رہے ہیں۔ نہیں، ایسے لوگ نہیں چاہئیں۔ اپنے ان احباب کو جمع کر لو جو سیدھے سادے باورچیوں کے دلوں کو رلا سکتے ہیں، اپنے انہی در در کی خاک چھاننے والے موسیقاروں کو بلا لو۔ سمندر اور محبت کو بےجا اظہار کمال کرنے والوں سے دور کی بھی نسبت نہیں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ خوشی خوشی پیتا اور صرف ایک ہی بوتل نہیں لیکن افسوس کہ مجھے جانا ہے۔ بہت سے کام میرے منتظر ہیں۔ یہ لو اور جا کے حرف الف کے نام پر جام اٹھاؤ۔ میری تجویز منظور ہو تو آج شام کو «سیکریٹ» پر آ جانا، پہلے باندھ کے نزدیک لنگر انداز ہے۔"

"بہت اچھا!" زیمر جسے گرے کی دریا دلی کا بخوبی علم تھا، جوش سے کہہ اٹھا۔ "ارے ڈوس، تعظیم سے سر جھکاؤ، کہو «ہاں» اور خوشی سے اپنی ہیٹ نچاؤ! کپتان گرے نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے!"

"ہاں" گرے نے سادگی سے جواب دیا۔ "تفصیلات میں تمہیں «سیکریٹ» پر بتاؤں‌گا۔ جہاں تک تمہارا..."

"الف کے نام پر!" ڈوس نے زیمر کے کہنی اور گرے کو آنکھ ماری۔ "لیکن حروف تہجی تو بہت سے ہیں! آپ ہمیں حرف یے کے نام پر کچھ نہ دیں‌گے کیا؟"

گرے نے انہیں کچھ اور پیسے دئے اور وہ دونوں چلے گئے۔ پھر اس نے ایک کمیشن ایجنٹ کے پاس جا کے اسے خفیہ طور پر فوری اہمیت کا ایک کام سپرد کیا جسے چھ دنوں میں مکمل کیا جانا تھا اور جس پر کثیر رقم صرف ہونے والی تھی۔ گرے اپنے جہاز پر لوٹا تو ایجنٹ ایک اسٹیم بوٹ پر سوار ہو رہا تھا۔ شام ہوتے ہوتے ریشم جہاز پر پہنچ گیا۔ ابھی تک نہ لتیکا واپس لوٹا تھا اور نہ ہی موسیقار آئے تھے۔ گرے پینٹن سے باتیں کرنے کے لئے اس کے پاس چلا گیا۔

یہاں یہ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گرے گزشتہ کئی برسوں سے اسی عملے کے ساتھ بحری سفر کرتا رہا تھا۔ شروع شروع میں تو ملاح اپنے کپتان کے طرز عمل سے حیران و پریشان رہتے تھے کیونکہ اس کے سفر اور قیام دونوں میں سنکی‌پن سا پایا جاتا تھا۔ قیام کا سلسلہ تو کبھی کبھی مہینوں تک جاری رہتا تھا اور وہ بھی نہایت ہی کم آباد جگہوں پر جہاں تجارت کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہی ہوتے تھے۔ لیکن

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ لوگ گرے کے "گرے ازم" سے نئے ولولے حاصل کرنے لگے۔ اکثر تو وہ صرف جہاز پر توازن برقرار رکھنے کے وزن کے ساتھ ہی سفر کرتا تھا کیونکہ منفعت‌بخس مال کو بھی محض اس وجہ سے لادنے سے انکار کر دیتا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں ہوتا تھا۔ کیا مجال جو کوئی اسے صابن، کیلیں، مشینوں کے مختلف حصے اور ایسی ہی دوسری چیزیں لادنے پر راضی کر لیتا جو جہاز کے گودام میں پڑی ہوئی بے‌کیف ضروریات کی بے‌جان تصاویر پیش کرتی رہتیں۔ لیکن پھلوں، چینی کے برتنوں، مویشیوں، مسالوں، چائے، تمباکو، کافی، ریشم اور آبنوس، صندل اور ساگون جیسی کمیاب لکڑیوں کی بار برداری پر ہمیشہ تیار ہو جاتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کے تخیل کی امارت پسندی کے عین مطابق تھا اور اس سے جہاز پر دلکش ماحول پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کہ «سیکریٹ» کا عملہ جس کی تربیت جدت و ندرت کی فضا میں ہوئی تھی، دوسرے تمام جہازوں کو قدرے حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ یہ جہاز ہمہ وقت عام، گھٹیا منافعے ہی کے دھوئیں میں لپٹے رہتے تھے۔ اس سب کے باوجود اس بار گرے کو ملاحوں کی نگاہوں میں اعتراض کی پرچھائیاں نظر آئیں: سب سے کندذہن ملاح تک جانتا تھا کہ مرمت کے لئے کسی جنگلی دریا میں ٹھہرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

پینٹن نے بالکل فطری طور پر کپتان کے احکام سب کو بتا دئے تھے۔ گرے جب اندر داخل ہوا تو اس کا نائب چھٹا سگار ختم کر رہا تھا، تیز تیز قدموں سے اپنے کیبن میں ٹہل رہا تھا، ماحول میں اتنا دھواں بھرا ہوا تھا کہ اس کا سر چکرا رہا تھا اور کرسیوں سے ٹکرا جاتا تھا۔ شام ہو چلی تھی، کھلے روشن دان سے سنہری شعاعیں اندر داخل ہو رہی تھیں جن میں کپتان کے خود کا پالش کیا ہوا چھجا چمک اٹھا۔

"تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں" پینٹن نے روٹھے روٹھے سے انداز میں کہا۔ "آپ کہیں تو ہم لنگر اٹھا سکتے ہیں۔"

"اب تک تو آپ کو میرے مزاج سے واقف ہو جانا چاہئے تھا" گرے نے نرمی سے کہا۔ "میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ کوئی پراسرار بات نہیں۔ لیلیانا میں لنگر انداز ہوتے ہی سب کچھ بتا دوں‌گا اور آپ کو سستے سگاروں پر ماچس کی تیلیاں ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہ جائے‌گی۔ جائیے لنگر اٹھا دیجئے۔"

پینٹن نے بےچینی سے مسکراتے ہوئے بھوں کھجائی۔

"جی ہاں، میں واقف ہوں۔ یہ نہیں کہ میں... اچھی بات ہے۔"

اس کے جانے کے بعد گرے ذرا دیر چپ چاپ بیٹھا نیم‌وا دروازے سے باہر دیکھتا رہا اور پھر خود اپنے کیبن میں چلا گیا۔ وہاں وہ پہلے بیٹھا پھر لیٹ گیا اور پھر جھنجھناتی زنجیر کو کھینچتے ہوئے آہنجے کی کھڑکھڑاہٹ کو سن کر اگلے حصے کے بلند عرشے پر جانے کا قصد کیا لیکن خیالوں میں کھو کر میز کے پاس لوٹ آیا جہاں اس کی انگلی نے جلدی سے روغنی کپڑے کے میزپوش کے آر پار ایک سیدھی لکیر

کھینچ دی۔ اتنے میں دروازے پر پڑنے والے مکے کی آواز اسے اس کی جنونی بےخودی کی حالت سے باھر لے آئی، اس نے کنجی گھما کے دروازہ کھولا اور لتیکا اندر داخل ھوا۔ زور زور سے ھانپتا ھوا ملاح اس پیامی کی طرح کھڑا تھا جس نے عین وقت پر پہنچ کے کسی کو پھانسی سے بچا لیا ھو۔

"میں نے باندھ کے اوپر جہاں میں کھڑا ھوا تھا، اپنے آپ سے کہا: ھمیں چل دینا چاھئے، لتیکا" اس نے تیزی سے بولتے ھوئے کہا، "کیونکہ میں نے یہاں اپنے ساتھیوں کو آھنجے کے ارد گرد منڈلاتے اور ھتھیلوں پر تھوکتے ھوئے دیکھ لیا تھا۔ میری نظریں عقابی جو ھیں۔ اور میں تیزی سے روانہ ھو گیا۔ میں تو کشتی کھینے والے کی پیٹھ پر اتنی زور زور سے سانسیں چھوڑ رھا تھا کہ غریب گھبراھٹ سے پسینے پسینے ھو گیا۔ ارے کپتان، آپ مجھے چھوڑ کے چل دینے والے تھے کیا؟"

"لتیکا" گرے نے اس کی لال بھبوکا آنکھوں میں جھانکتے ھوئے کہا، "میں توقع کر رھا تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ آج صبح تک لوٹ آؤگے۔ گدی پر ٹھنڈا پانی ڈال لیا تھا کیا؟"

"جی ھاں۔ لیکن اتنا نہیں جتنا پیا جا سکتا ھے۔ میں نے کام انجام دے دیا۔"

"اچھا تو بتاؤ۔"

"باتوں میں کیا رکھا ھے، کپتان۔ میں نے اس کاغذ پر سب کچھ لکھ دیا ھے۔ پڑھ لیجئے۔ میں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اب میں چل دیا۔"

"کہاں چل دئے؟"

"میں آپ کے چہرے سے اندازہ لگا سکتا ھوں کہ میں نے اپنی گدی پر کافی ٹھنڈا پانی نہیں ڈالا تھا۔"

وہ مڑا اور کسی نابینا کی جیسی عجیب چال سے باھر نکل گیا۔ گرے نے تہہ کئے ھوئے کاغذ کو کھولا تو اسے ٹیڑھے میڑھے جنگلے سے متلتی جلتی گھسیٹ عبارت نظر آئی جسے وجود میں لاتے ھوئے پنسل کو بھی حیرت ھوئی ھوگی۔ لتیکا نے لکھا تھا:

«احکام کی تعمیل کرتے ھوئے میں پانچ بجے شام کے بعد اس سڑک پر گیا۔ بھوری چھت کا گھر جس میں دونوں جانب دو کھڑکیاں ھیں اور ترکاریوں کا ایک باغ۔ متعلقہ خاتون دو بار باھر آئی، ایک بار پانی کے لئے اور دوسری بار آتش‌دان کے واسطے چھپٹیاں لینے کے لئے۔ اندھیرا ھونے کے بعد کھڑکی سے اندر جھانکنے کا موقع ملا لیکن پردے کی وجہ سے کچھ دیکھ نہ سکا۔»

اس کے بعد کئی اطلاعات گھریلو نوعیت کی تھیں جو صاف ظاھر ھو رھا تھا کہ لتیکا نے شراب پیتے ھوئے کسی سے باتیں کر کے حاصل کی تھیں کیونکہ رپورٹ اچانک ان الفاظ پر ختم ھو گئی تھی: «بیان کو مربوط بنانے کے لئے کچھ اپنی طرف سے بھی جوڑنا پڑا ھے۔»

تاهم رپورٹ کا لب لباب وهی تھا جسے هم پہلے باب هی سے جانتے هیں۔ گرے نے کاغذ کو اپنی دراز میں رکھ دیا، سیٹی بجا کے پہریدار کو بلایا اور اس سے پینٹن کو بلا لانے کو کہا لیکن پینٹن کے بجائے بڑا ملاح ایٹ‌ووڈ اپنی چڑھی هوئی آستینوں کو جلدی جلدی اتارتا هوا اندر داخل هوا۔

"هم نے جهاز کو باندھ کے پاس کھڑا کر دیا هے۔ پینٹن نے مجھے یه معلوم کرنے کے لئے بھیجا هے که آپ کے مزید احکام کیا هیں۔ وہ خود اس وقت کچھ ایسے لوگوں سے لڑ جھگڑ کر انهیں بھگانے میں مصروف هیں جن میں سے کچھ کے پاس نفیریاں اور ڈھول هیں تو کچھ کے پاس وائلن۔ کیا آپ نے ان لوگوں سے جهاز پر آنے کو کہا تھا؟ پینٹن آپ کو وهیں بلا رهے هیں، کہتے هیں که ان کا تو سر چکرانے لگا۔"

"هاں، ایٹ‌ووڈ۔ میں نے موسیقاروں کو جهاز پر مدعو کیا تھا۔ ان لوگوں سے کہو که ابھی عملے کی رهائش والے حصے میں چلے جائیں بعد میں ان کے لئے انتظام کر دیں گے۔ ان سے اور ملاحوں سے یه بھی کہه دو که میں پندرہ منٹ میں عرشے پر آ رها هوں اور چاهتا هوں که هر شخص وهاں موجود رهے۔ میرا خیال هے که میں جو کچھ کہنا چاهتا هوں اسے پینٹن بھی سنیں گے اور تم بھی۔"

ایٹ‌ووڈ نے اپنی بائیں بھوں چڑھا لی۔ وہ چند لمحوں تک دروازے کے پاس کھڑا رها پھر دبک کے باهر نکل گیا۔

اگلے دس منٹ تک گرے اپنے چهرے کو هاتھوں میں چھپائے رها۔ وہ نه خود کو کسی بات کے لئے تیار کر رها تھا اور نه هی کوئی اندازہ لگا رها تھا۔ وہ تو بس ذرا دیر تک یوں هی خاموش رهنا چاهتا تھا۔ اس دوران هر شخص قیاس آرائیوں سے بھرے هوئے تجسس کے ساتھ بےچینی سے اس کا منتظر تھا۔ وہ نمودار هوا تو اس نے لوگوں کے چهروں پر ناممکن باتوں کی توقعات دیکھیں لیکن جو کچھ هو رها تھا اسے چونکه وہ بالکل فطری تصور کر رها تھا اس لئے ان دوسرے لوگوں کی روحوں کے هیجان نے خود اس کی روح میں کچھ بھناهٹ سی پیدا کر دی۔

"یه کوئی غیرمعمولی بات نهیں" گرے نے جهاز کے دیدبان کے زینے پر بیٹھتے هوئے کہا۔ "هم لوگ دریا میں اس وقت تک لنگر انداز رهیں گے جب تک بادبان نه بدل لیں۔ سرخ ریشم جو لایا گیا هے اسے سب لوگ دیکھ چکے هیں۔ بادبان ساز بلنٹ اس کپڑے سے «سیکریٹ» کے لئے نئے بادبانوں کی تیاری کے نگراں هوں گے۔ اس کے بعد هم لوگ روانه هو جائیں گے لیکن میں یه نهیں کہه سکتا که کہاں کے لئے۔ بهرحال وہ جگه یهاں سے دور نه هوگی۔ میں اپنی بیوی کو لینے جا رها هوں۔ ابھی وہ میری بیوی نهیں هے لیکن هو جائے گی۔ میرے جهاز کے بادبان سرخ هونے چاهئیں تاکه جیسا که همارے درمیان طے پایا هے، وہ همیں دور هی سے دیکھ لے۔ بس اتنی سی بات هے، اس میں کوئی پراسرار معامله نهیں۔ اور اب هم اس کے بارے میں اور کچھ نه کہیں گے۔"

"واقعی" ایٹ‌ووڈ نے ملاحوں کی مسکراہٹوں سے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کہا کہ سب کو حیرت اور اس سے زیادہ خوشی ہوئی ہے لیکن کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا ہے۔ "تو یہ بات ہے، کپتان... ہمارا کام جانچنا پرکھنا نہیں بلکہ حکم ماننا ہے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگا۔ میری طرف سے مبارک‌باد قبول فرمائیے۔"

"شکریہ۔"

گرے نے جہاز کے بڑے ملاح کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا لیکن آخرالذکر نے زبردست کوشش سے مصافحے کا جواب اتنی طاقت کے ساتھ دیا کہ کپتان کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے بعد ملاح یکے بعد دیگرے اس کے پاس آ آ کر مبارک‌باد دینے لگے، ایک شخص کی پرتپاک مسکراہٹ کی جگہ دوسرے کی مسکراہٹ لیتی رہی۔ نہ کسی نے شور مچایا اور نہ ہی کوئی نعرہ تحسین بلند ہوا کیونکہ سبھی نے کپتان کی مختصر تقریر میں کسی بہت ہی خاص کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ پینٹن نے اطمینان کی گہری سانس لی اور وہ واضح طور پر ہشاش بشاش نظر آنے لگا کیونکہ اس کے دل پر سے بھاری بوجھ پگھل کر غائب ہو گیا تھا۔ ایک صرف جہاز کا بڑھئی ہی کچھ ناراض سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بےجان انداز میں گرے سے مصافحہ کر کے روکھے تیکھے انداز میں کہا:

"آخر ایسی بات کا آپ تصور ہی کیسے کر سکے، کپتان؟"

"یہ تو بس تمہاری کلہاڑی کے وار جیسا ہی تھا" گرے نے کہا۔ "ارے زیمر، تمہارے ساتھیوں سے ملاقات کرنی چاہئے۔"

وائلن نواز نے موسیقاروں کی پیٹھوں پر ہاتھ مار مار کے بےڈھنگے کپڑوں میں ملبوس سات آدمیوں کو بھیڑ سے باہر* نکالا۔

"یہ رہے" زیمر نے کہا۔ "یہ بڑا ترم بجاتے ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ بجاتے نہیں، دھماکا کرتے ہیں۔ اور یہ بےداڑھی والے دونوں ساتھی کچھ اس انداز سے بگل بجاتے ہیں کہ سامعین کا محاذ جنگ پر جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہ رہے الفوزچی، کورنٹ نواز اور دوسرے وائلن نواز۔ یہ سب کے سب سرگرم اور خاص فنکار – میرا مطلب اپنے آپ سے ہے – کے سر سے سر ملانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور یہ ہیں فرٹز، ہمارے شاندار بینڈ کے ماسٹر اور طبل نواز۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ طبل نواز عموماً مایوس سے نظر آتے ہیں لیکن فرٹز بڑے وقار اور جوش و خروش سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کے فن میں خلوص پایا جاتا ہے اور کوئی چیز اتنی ہی سیدھی سادی جتنی کی ان کی چوبیں ہیں۔ اور بھی کچھ ہوگا، کپتان گرے؟"

"شاندار۔ تم لوگوں کے لئے گودام میں جگہ بنا دی گئی ہے جو اس بار ظاہر ہے کہ طرح طرح کی دھیمے اور تیز سروں، نیچی اور بلند آوازوں کی موسیقی سے بھرا

ہوگا۔ اچھا تو اب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر چلے جائیں۔ لنگر اٹھائیے اور روانہ ہو جائیے، پینٹن! دو گھنٹوں کے بعد میں خود آ کے آپ کی جگہ سنبھال لوں گا۔"

اسے پتا بھی نہ چلا اور یہ دونوں گھنٹے گزر گئے کیونکہ یہ وقت اسی باطنی موسیقی کی فضا میں کٹا جس نے اس کے شعور کو اسی طرح کبھی ترک نہیں کیا تھا جیسے نبض شریانوں کو ترک نہیں کرتی۔ وہ صرف ایک ہی خیال، ایک ہی خواہش اور ایک ہی مقصد سے سرشار تھا۔ باعمل آدمی ہونے کی بنا پر اس نے واقعات کی پیش بینی کر لی تھی اور اب اسے تاسف تھا تو بس یہ کہ ان واقعات کو شطرنج کی بساط پر مہروں کی نقل و حرکت کی جیسی تیزی اور آسانی سے ظہور میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ وہ ظاہری طور پر اتنا پرسکون تھا کہ اس باطنی ہیجان کا ذرا بھی پتا نہیں چلتا تھا جس کی بھنبھناہٹ سر پر بجتی ہوئی کسی زبردست گھنٹی کی آواز کی طرح اس کے سارے جسم میں بےحس کر دینے والی مضطرب کراہ کی شکل میں گونج رہی تھی۔ اس کیفیت نے آخرکار اسے دل ہی دل میں گنتی گننے پر مجبور کر دیا: "ایک... دو... تین..." یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا یہاں تک کہ اس نے کہا: "ایک ہزار۔" یہ دماغی ورزش رنگ لائی اور آخرکار وہ اپنے منصوبے کا غیرجذباتی انداز میں تجزیہ کرنے کے قابل ہو گیا۔ اسے حیرت سی ہوئی کہ وہ یہ بھی تصور نہیں کر پا رہا ہے کہ اسول ایک فرد کی حیثیت سے کیسی ہے کیونکہ کبھی اس سے بات کرنے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ انسان کسی شخص کو ایک حد تک سمجھ سکتا ہے اگر خود کو وہی شخص تصور کرتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات کو اپنے چہرے پر پیدا کر لے۔ گرے کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہ پایا جانےوالا ایک اجنبی تاثر جھلکنے لگا اور اس کی مونچھوں کے نیچے ہونٹ خفیف، شرمیلی مسکراہٹ سے سکڑنے لگے لیکن اتنے میں اچانک وہ ہوش میں آ گیا اور زور سے قہقہہ لگا کر پینٹن کو کام سے چھٹی دینے کے لئے اس کے پاس چلا گیا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ پینٹن نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لئے تھے اور پرکار کے پاس آگے پیچھے ٹہل کے جہاز چلانے والے سے کہہ رہا تھا:

"بائیں طرف گھماؤ، ایک چوتھائی پوائنٹ۔ گھماؤ۔ ٹھہر جاؤ۔ ایک چوتھائی پوائنٹ اور۔"

"سیکریٹ" ہاف ٹیک پر روانی سے چل رہا تھا۔

"سنیے" پینٹن نے گرے سے کہا، "میں بہت خوش ہوں۔"

"کس بات پر؟"

"اسی پر جس پر آپ خوش ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا۔ یہ بات یہیں دیدبان پر میری سمجھ میں آئی۔" اس نے عیاری کے ساتھ آنکھ ماری اور پائپ کی آگ سے اس کی مسکراہٹ نمایاں ہو گئی۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" گرے نے اچانک یہ سمجھتے ہوئے کہ پینٹن کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، کہا۔ "اور آپ کو معلوم کیا ہو گیا؟"

"اسمگلنگ کے مال کو اندر لے جانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ کوئی جس قسم کے بھی بادبان لگانا چاہئے لگا سکتا ہے۔ آپ نے بھی کیا دماغ پایا ہے، گرے!"

"بچارے پینٹن!" کپتان نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طیش میں آ جائے یا ہنس پڑے۔" واقعی آپ کو بڑی دور کی سوجھی ہے لیکن حقیقت سے اس کا ذرا بھی تعلق نہیں۔ جا کے سو جائیے۔ یقین مانئے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ میں نے جو کچھ کہا تھا بالکل وہی کر رہا ہوں۔"

اس نے پینٹن کو سونے کے لئے نیچے بھیج دیا، جہاز کے راستے کی جانچ کی اور بیٹھ گیا۔ ہمیں اس کو اسی حال میں چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے۔

٦

اسول اکیلی رہ جاتی ہے

لونگرین نے وہ رات سمندر میں گزاری۔ اس نے نہ پلکیں جھپکائیں نہ مچھلیوں کا شکار کھیلا، بس یوں ہی کسی واضح راستے کے بغیر اپنی کشتی کو چلاتا اور لہروں کی آوازوں کو سنتا رہا، چہرے کو ہوا کے رخ پر کئے ہوئے سوچتا رہا۔ زندگی کے دشوار ترین زمانوں میں اس طرح تنہا ادھر ادھر منڈلاتے پھرنے سے زیادہ اور کوئی بھی چیز اس کی روح کو سکون نہیں عطا کرتی تھی۔ سناٹے، صرف سناٹے اور تنہائی ہی کی اس کو ضرورت ہوتی تھی تاکہ وہ اپنی باطنی دنیا کی انتہائی دھیمی اور مبہم ترین آوازوں کو واضح طور پر سن سکے۔ اس رات اس کے خیالات مستقبل، افلاس اور اسول پر مرکوز تھے۔ اس کے لئے اسول کو مختصر مدت کے لئے بھی تنہا چھوڑنا ناقابل برداشت حد تک دشوار تھا اس کے علاوہ اس زخم کے جو بھر چکا تھا، ہرے ہو جانے سے بھی وہ ڈرتا تھا۔ کسی جہاز پر دوبارہ ملازمت کر لینے کے بعد شاید وہ تصور کرتا کہ اس کی محبوبہ جو اس کے لئے کبھی بھی مری نہیں تھی، کپرنا میں اس کی منتظر ہے اور واپس لوٹنے کے بعد وہ مردہ توقع کے غم کے ساتھ اپنے گھر کی طرف بڑھتا۔ میری کے اب کبھی گھر کے دروازے سے باہر آنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ لیکن وہ اسول کی گزر بسر کا انتظام کرنا چاہتا تھا اسی لئے اس نے وہی کرنے کا فیصلہ کیا جس کی اسول سے متعلق اس کی فکریں متقاضی تھیں۔

لونگرین واپس لوٹا تو اسول گھر نہیں پہنچی تھی۔ اس کے بہت سویرے ہی ٹہلنے کے لئے نکل کھڑے ہونے سے باپ کو کبھی تشویش نہیں لاحق ہوا کرتی تھی

لیکن اس کا انتظار کرتے ہوئے وہ کچھ فکرمند سا ہو گیا۔ لمبے لمبے قدموں سے ٹہلتے ہوئے ایک بار جو وہ مڑا تو بالکل اچانک ہی اسول پر نظر پڑی۔ وہ ہلکی سی بھی آواز پیدا کئے بغیر تیزی سے گھر میں داخل ہوئی تھی اور بالکل خاموشی سے باپ کے قریب آ کر اپنے چہرے کی چمک دمک سے جو اس کے جوش و خروش کی آئینہ دار تھی، باپ کو تقریباً خوف‌زدہ کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسول کا دوسرا روپ نمودار ہو گیا ہو ــ حقیقی روپ جس کی عموماً صرف انسان کی آنکھیں ہی تصدیق کرتی ہیں۔ وہ بالکل خاموش تھی اور اس نے باپ کے چہرے کو ایسے عجیب و غریب انداز سے دیکھا کہ لونگرین فوراً ہی پوچھ بیٹھا:

"بیٹی، کچھ طبیعت خراب ہے کیا؟"

اسول نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔ آخر جب باپ کے الفاظ کا مفہوم اسول کے اندرونی کان تک پہنچا تو وہ اس ٹہنی کی طرح جسے کسی نے چھو لیا ہو، چونک پڑی اور ایک طویل، مطمئن اور فاتحانہ قہقہہ لگایا۔ اسے کچھ نہ کچھ کہنا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اسے کوئی بات سوچنے کی ضرورت نہ محسوس ہوئی اور اس نے کہا:

"جی نہیں، بالکل بھلی چنگی ہوں... یہ آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں خوش ہوں۔ واقعی خوش ہوں اور اس لئے کہ دن بہت خوبصورت ہے۔ آپ نے کیا سوچا ہے؟ آپ کا چہرہ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ آپ نے کوئی بات سوچ لی ہے۔"

"میں نے کچھ بھی سوچا ہو" لونگرین نے اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا، "لیکن میں جانتا ہوں کہ تم سمجھ جاؤگی کہ میں یہ قدم کیوں اٹھا رہا ہوں۔ ہماری گزر بسر کا کوئی سہارا نہیں رہا۔ لمبے بحری سفر پر تو اب میں جانے سے رہا لیکن کاسیٹ اور لیس کے درمیان چلنے والی دخانی ڈاک کشتی پر نوکری کر لوں‌گا۔"

"جی ہاں" اسول نے باپ کی فکروں اور پریشانیوں میں شریک ہونے کی کوشش کرتے لیکن اس خیال سے ڈرتے ہوئے کہ وہ خود کو اتنا زیادہ خوش و خرم ہونے سے باز نہیں رکھ پا رہی ہے، جیسے کہیں دور سے کہا۔ "یہ تو بڑی بھیانک بات ہے۔ مجھے تنہائی کا احساس بہت پریشان کرےگا۔ جلد ہی واپس آئیےگا۔" یہ کہہ کر وہ ناقابل مزاحمت مسکراہٹ سے کھل اٹھی۔ "اور عجلت کیجئے، پیارے۔ میں آپ کی منتظر رہوں‌گی۔"

"اسول!" لونگرین نے اس کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لے کر اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ آخر ہوا کیا؟"

وہ اس خیال سے کہ باپ کے اندیشوں کو دور کرنا چاہئے، اپنے جوش انبساط پر قابو پاتے ہوئے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن... لیکن اس کی آنکھیں اب بھی نئی زندگی کے ساتھ چمک رہی تھیں۔

<<

"آپ بھی عجیب ھیں۔ ارے ھوتا کیا۔ میں تو اخروٹ چن رھی تھی۔"

لونگرین نے اس بات پر ھرگز یقین نہ کیا ھوتا لیکن وہ تو خود اپنے ھی خیالوں میں کھویا ھوا تھا۔ اس کے بعد باپ بیٹی کی گفتگو عام ڈھرے پر چل نکلی اور تفصیلات طے پانے لگیں۔ ملاح نے اسول کو بتایا کہ اسے کن کن چیزوں کی ضرورت ھوگی، انہیں تھیلے میں رکھنے کو کہا اور اسے ھدایات دیں:

"میں کوئی دس دنوں میں لوٹ آؤں‌گا۔ تم میری بندوق رھن رکھ دینا اور گھر ھی میں رھا کرنا۔ کوئی تمہیں تنگ کرے تو کہہ دینا: «لونگرین جلد ھی واپس آئےگا۔» میرے بارے میں سوچ سوچ کے پریشان نہ ھونا، میرا کچھ بھی نہ بگڑےگا۔"

پھر اس نے کھانا کھایا، بیٹی کو جوش سے پیار کر کے تھیلے کو شانے پر لٹکایا اور سڑک پر نکل آیا جو شہر کو جاتی تھی۔ اسول اسے دیکھتی رھی اور جب وہ نکڑ پر نظروں سے اوجھل ھو گیا تو گھر کے اندر آ گئی۔ اسے صفائی اور ایسے ھی کئی دوسرے کام کرنے تھے لیکن ان سب کو بھول بیٹھی۔ اس نے قدرے حیرت کی دلچسپی کے ساتھ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں جیسے وہ اس گھر میں اب اجنبی بن چکی ھو جو اس کے ھوش سنبھالنے کے وقت ھی سے اس کے وجود کا ایسا اھم جزو رھا تھا کہ لگتا تھا اس کی شبیہ ھمیشہ ھی اس کے دل پر نقش رھی ھے اور جو اب ایسا لگ رھا تھا جیسا کسی کو عرصے تک باھر رھنے اور مختلف زندگی گزارنے کے بعد واپسی پر اپنا آبائی وطن لگتا ھے۔ لیکن اسے گھر کو ٹھکرانے سے متعلق اپنا یہ رویہ نازیبا اور غلط معلوم ھوا۔ وہ اس میز کے پاس بیٹھ گئی جس پر لونگرین اپنے کھلونے بنایا کرتا تھا اور سریش لگا کر کشتی کے دنبالے سے پتوار کو جوڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ ان چیزوں کو دیکھتے ھوئے اس نے نادانستہ طور پر ان کے حقیقی سائز اور سرگرمیوں کے ساتھ ان کا تصور کیا۔ اس طرح اس صبح کو جو کچھ ھوا تھا وہ سب ایک بار پھر اس کے دل میں مرتعش جوش و خروش کے ساتھ بیدار ھو گیا اور سورج جتنی بڑی سونے کی ایک انگوٹھی سمندر پار سے اس کے قدموں میں آ گری۔

وہ گھر کے اندر نہ رہ سکی، باھر نکلی اور لیس کے لئے روانہ ھو گئی۔ شہر میں نہ اسے کوئی کام تھا اور نہ ھی معلوم تھا کہ کیوں جا رھی ھے پھر بھی وہ خود کو جانے سے باز نہ رکھ سکی۔ راستے میں اس کی ملاقات ایک شخص سے ھوئی جس نے راستہ دریافت کیا۔ اس نے اس شخص کو تفصیلی معلومات فراھم کیں اور آگے بڑھتے ھی اس واقعے کو فراموش کر دیا۔

طویل راستہ یوں تیزی سے کٹ گیا جیسے وہ اپنے ساتھ کوئی چڑیا لئے جا رھی تھی اور تمام وقت محبت کے ساتھ اسی کی طرف متوجہ رھی۔ شہر کے پاس پہنچ کے وہ اس کے عظیم دائرے کے شور سے کچھ گھبرا سی اٹھی لیکن اب وہ پہلے کی طرح شہر کے بس میں نہیں تھی جبکہ وہ اسے خوف‌زدہ کر کے خاموش بزدل بنا دیا کرتا تھا۔ اس نے دلیری سے شہر کا مقابلہ کیا۔ وہ کشادہ سایہ‌دار سڑک کے دائرے

سے دھیرے دھیرے سکون و اعتماد سے چلتی ہوئی، درختوں کے نیلگوں سایوں کو پار کرتی اور راہگیروں کے چہروں کو جھینپے بغیر اعتماد سے دیکھتی ہوئی گزری۔ غور سے مشاہدہ کرنے والے کو دن کے دوران یہاں ایک اجنبی کو، ایک انوکھی لڑکی کو دیکھنے کا موقع ملا جو بھانت بھانت کے لوگوں پر مشتمل ہجوم کے درمیان سے خیالوں میں کھوئی ہوئی گزری تھی۔ چوک میں پہنچ کر اس نے فوارے کے پانی کی دھار میں اپنا ہاتھ ڈال کے چمکتی ہوئی پھوار کو انگلیوں سے چھوا پھر بیٹھ کے کچھ دیر آرام کیا اور جنگل سے گزرتی ہوئی سڑک پر واپس آ گئی۔ اس بار اس نے راستے کو نئے جوش و خروش کے ساتھ، اتنے ہی پرسکون اور شفاف موڈ کے ساتھ طے کیا جتنی کہ شام کو کوئی ندی ہوتی ہے جس نے بالآخر دن کے چمچماتے ہوئے آئینوں کو پرچھائیوں کی خاموش تمتماھٹ سے بدل لیا ہو۔ گاؤں کے بالکل پاس پہنچ کے اس نے اسی کوئلے والے کو دیکھا جس نے تصور کیا تھا کہ اس کے ٹوکرے میں پھول نکل رہے ہیں۔ وہ دو عجیب و غریب، بیزار بیزار سے آدمیوں کے ساتھ جو کالک اور دھول سے اٹے ہوئے تھے، اپنے چھکڑے کے پہلو میں کھڑا ہوا تھا۔ اسول باغ باغ ہو اٹھی۔

"کہئے فلپ۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں، مکھی۔ ایک پہیا ڈھیلا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے ٹھیک کیا اور اب سگریٹ پی رہا ہوں اور اپنے دوستوں سے گپیں لڑا رہا ہوں۔ اور تم کہاں تھیں؟"

اسول نے جواب نہ دیا۔

"دیکھئے فلپ، میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں اور اسی لئے صرف آپ کو یہ بات بتا رہی ہوں۔ میں جلد ہی یہاں سے جا رہی ہوں۔ شاید ہمیشہ کے لئے یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔ لیکن کسی سے کہہ نہ دیجئے گا۔"

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم یہاں سے چلی جانا چاھتی ہو؟ لیکن کہاں؟" کوئلے والے کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا جس سے اس کی داڑھی کچھ اور بھی زیادہ لمبی نظر آنے لگی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" پھر اسول نے دھیرے دھیرے کھلی ہوئی جگہ پر، ایلم کے درخت پر جس کے نیچے چھکڑا کھڑا ہوا تھا، گھاس پر جو گلابی جھٹپٹے میں نہایت شاداب معلوم ہو رہی تھی اور خاموش، خستہ‌حال کوئلے والوں پر نظریں دوڑائیں اور قدرے توقف سے کہا: "مجھے نہیں معلوم۔ مجھے نہ دن معلوم ہے نہ وقت اور نہ ہی یہ کہ یہ واقعہ کہاں پیش آئےگا۔ میں آپ کو اور کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ اسی لئے آپ سے خدا حافظ کہنا چاھتی ہوں، احتیاط کے طور پر۔ آپ نے اکثر مجھے اپنے چھکڑے پر بٹھایا ہے۔"

اسول نے اس کے کوئلے کی دھول سے سیاہ زبردست ھاتھ کو پکڑا اور مصافحے

کے طور پر اسے جنبش دینے میں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گئی۔ مزدور کا چہرہ سخت مسکراہٹ سے چٹخ سا گیا۔ لڑکی نے سر ہلایا، مڑی اور چل دی۔ فلپ اور اس کے دوست اپنے سروں کو موڑ بھی نہیں پائے تھے کہ وہ غائب ہو گئی۔

"حیرت‌انگیز واقعہ ہے نا؟" کوئلے والے نے کہا۔ "آدمی اسے آخر کس رنگ میں دیکھے؟ آج اس لڑکی میں کوئی بات پائی جاتی ہے... میرا مطلب ہے، کوئی عجیب بات۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو" دوسرے آدمی نے تائید کی۔ "یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یہ بات بس یوں ہی کہہ رہی تھی یا ہمیں یقین کرانے کی کوشاں تھی۔ ہمیں اس قصے سے کیا لینا دینا۔"

"ہمیں اس قصے سے کیا لینا دینا" تیسرے آدمی نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر وہ تینوں چھکڑے پر سوار ہوئے اور پتھریلی سڑک پر پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ غبار کے بادل میں کھو گئے۔

۷

ارغوانی "سیکریٹ"

سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ عجیب و غریب شکلوں شبیہوں سے بھری ہوئی ہلکی ہلکی دھند دور تک پھیلے جنگل پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک بےنام شکاری جو ابھی ابھی الاؤ کے پاس سے اٹھا تھا، دریا کے بالکل متوازی چلا جا رہا تھا جس کے فضائی خالی‌پن کی روشنی درختوں سے چھن چھن کے اس تک پہنچ رہی تھی لیکن محتاط شکاری دریا کے کنارے نہیں گیا تھا اور پہاڑوں کی طرف جاتے ہوئے ریچھ کے قدموں کے تازے نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔

اتنے میں ایک آواز کسی پرخطر موقعے کے ناگہانی‌پن کے ساتھ درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ابھری، یہ کسی نے کا نغمہ تھا۔ نے نواز نے عرشے پر آ کر بڑے مغموم اور ملول سروں میں کسی نغمے کا ایک ٹکڑا بجایا۔ اس کی صدا کسی انسان کی غم کو راز میں رکھنے والی آواز کی طرح تھرتھرائی، ابھر کے اداس کھنک کے ساتھ مسکرائی اور اچانک ہی ڈوب گئی۔ دور، اسی نغمے کی ہلکی صدائے بازگشت سنائی دی۔

شکاری نے ریچھ کے قدموں کے نشانات پر ٹوٹی ہوئی ٹہنی سے نشان لگایا اور پانی کی طرف چل دیا۔ کہرا ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوا تھا اور یہ دریا سے

دھیرے دھیرے باھر نکلتے ھوئے زبردست جہاز کے یک‌رخے منظر کو دھندلا کر رھا تھا۔ اس کے بندھے ھوئے بادبانوں میں اچانک جان سی پڑ گئی، یہ کھل کے ھاروں کی طرح لٹک گئے اور اپنی بڑی بڑی شکنوں کی کمزور ڈھالوں سے مستولوں کو ڈھک لیا۔ شکاری کو لوگوں کی آوازیں اور قدموں کی آھٹیں سنائی دے رھی تھیں۔ ساحلی ھوائیں جو چلنے کی کوشاں تھیں، دھیرے دھیرے بادبانوں سے ٹکرائیں؛ آخرکار آفتاب کی حرارت نے مطلوبہ کام انجام دیا، ھواؤں میں تیزی آ گئی، انھوں نے کھرے کو اونچا اٹھا دیا اور مستولوں میں لگی ھوئی مخروطی بلیوں کے کنارے کنارے تیرتی ھوئی ھلکے ارغوانی بادبانوں تک پہنچ گئیں جو گلابوں سے بھرے ھوئے معلوم ھو رھے تھے۔ مستولوں اور رسوں کی سفیدی پر گلابی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ ھر شے سفید تھی سوائے پوری طرح کھلے، ھوا سے بھرے ھوئے بادبانوں کے جو حقیقی مسرت کے رنگ کے تھے۔

کنارے پر کھڑے محو حیرت شکاری نے زور زور سے آنکھیں ملیں اور آخرکار اسے یقین ھو گیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رھا تھا، حقیقت ھی تھا خواب نہیں۔ جہاز دریا کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ھو گیا تب بھی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتا رھا، آخرکار اس نے شانے اچکائے اور اپنے ریچھ کی تلاش میں چل دیا۔

"سیکریٹ" دریا سے گزر رھا تھا تو گرے خود پہئیے کے پاس کھڑا ھوا تھا، اس نے جہاز چلانے والے پر اعتبار نہیں کیا تھا کیونکہ اتھلی جگھوں سے ڈر رھا تھا۔ پینٹن اپنی نئی بنی ھوئی داڑھی، نئے اونی سوٹ اور نئی چمکتی ھوئی ٹوپی کے ساتھ کپتان کی مرضی کے آگے سر جھکائے، روٹھا روٹھا سا اس کے قریب ھی بیٹھا ھوا تھا۔ اسے پہلے کی طرح اب بھی گرے کے ارادوں اور اس ارغوانی شان و شوکت میں کوئی تعلق نہیں نظر آ رھا تھا۔

"اب" گرے نے کہا، "جبکہ میرے بادبان چمک رھے ھیں، ھوائیں موافق ھیں اور میرا دل اس خوشی سے پھولا نہیں سما رھا ھے جو اس سے بھی بڑی ھے جس سے ھاتھی کسی ننھی گلھری کو دیکھ کر ھم‌کنار ھوتا ھے، میں آپ کو جیسا کہ میں نے لیس میں وعدہ کیا تھا، اپنے خیالوں سے ھم‌آھنگ کرنے کی کوشش کروں گا۔ مہربانی کر کے ذھن میں رکھئے کہ میں آپ کو کند ذھن یا ضدی نہیں تصور کرتا۔ نہیں، آپ تو مثالی جہاز راں ھیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ لیکن دوسروں کی زبردست اکثریت کی طرح آپ بھی تمام سیدھی سادی سچائیوں کی آوازوں کو زندگی کے دبیز شیشے کے پیچھے سے سنتے ھیں، وہ پکارتی ھیں لیکن آپ انھیں سن نہیں سکتے۔ جو کچھ میں کر رھا ھوں وہ حسن اور ناقابل حصول پر فرسودہ قسم کے اعتقاد میں اپنا وجود رکھتا ھے اور درحقیقت اتنا ھی قابل حصول اور ممکن ھے جتنی کہ کسی پرفضا مقام پر تفریح۔ آپ جلد ھی ایک ایسی لڑکی کو دیکھیں گے جو اس طریقے کے سوا جس پر میں عمل کر رھا ھوں اور

جسے آپ دیکھ رہے ہیں، کسی اور طریقے سے نہ شادی کر سکتی ہے اور نہ ہی اسے کرنا چاہئے۔"

اس نے مختصراً وہ سب جس سے ہم بخوبی واقف ہیں، بیان کر کے آخر میں کہا:

"آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں قسمت، قوت ارادی اور انسانی فطرت کس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو گئی ہیں۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں جو میری راہ دیکھ رہی ہے اور صرف میری ہی راہ دیکھ سکتی ہے جبکہ مجھے اس کے سوا اور کوئی بھی نہ چاہئے۔ سبب شاید صرف یہ ہے کہ اسی لڑکی کی بدولت ایک سیدھی سادی سچائی میری سمجھ میں آ گئی جو یہ ہے: معجزے انسان کو خود ہی دکھانے چاہئیں۔ قابل قدر سمجھ کر حفاظت سے رکھے ہوئے کسی سکے کے حصول کو کوئی شخص سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہو تو اسے یہ سکہ دے دینا کوئی ٹیڑھی کھیر نہیں لیکن اگر اس کی روح کسی آتشیں پودے کے بیج کی متلاشی ہے جسے معجزہ کہنا چاہئے تو آپ سے ممکن ہو سکے تو یہ معجزہ بھی دکھا ہی دیجئے۔ اس شخص کی روح بدل جائےگی اور خود آپ کی بھی۔ زنداں کا حاکم اعلا خود اپنی مرضی سے جب کسی قیدی کو رہا کر دے، کوئی کروڑپتی جب اپنے کلرک کو ایک بنگلہ، اوپیرا گانے والی ایک لڑکی اور ایک تجوری دے دے، کوئی جاکی کسی بدقسمت گھوڑے کو آگے نکل جانے کا موقع دینے کے لئے جب صرف ایک بار اپنے گھوڑے کو روک لے تو ہر شخص سمجھ جائےگا کہ یہ کتنی خوشگوار، کیسی ناقابل بیان حد تک شاندار بات ہے۔ لیکن دوسرے معجزے بھی ہوتے ہیں جو کم اہمیت نہیں رکھتے: مسکراہٹ، ہنسی مذاق، عفو اور مناسب وقت پر کہا جانے والا صحیح لفظ۔ انسان ایسی خصلت کا مالک ہو تو سمجھنا چاہئے کہ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو ہماری — اسول کی اور میری — ابتدا ہمارے لئے ہمیشہ ہی بادبانوں کی اسی ارغوانی چمک دمک میں برقرار رہےگی جو ایک محبت شناس دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ آپ میری بات سمجھ گئے نا؟"

"ہاں، کپتان۔" پینٹن نے حلق صاف کیا اور سلیقے سے تہہ کئے ہوئے صاف رومال سے مونچھیں پونچھیں۔ "مجھ پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ آپ کی باتیں میرے دل کو لگیں۔ میں نیچے جا کے نیکس سے معافی مانگوںگا کیونکہ کل اس نے ایک بالٹی ڈبو دی تھی تو میں نے اسے ڈانٹا تھا۔ میں اسے کچھ تمباکو بھی دوںگا، اپنی تمباکو تو وہ کل تاش میں ہار بیٹھا ہے۔"

گرے جو اپنے لفظوں کے اتنی تیزی سے رنگ لانے پر ذرا اچنبھے میں پڑ گیا تھا، ابھی جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ پینٹن کھٹ کھٹ کرتا سیڑھی سے نیچے اتر گیا اور دور جا کے اس کے ٹھنڈی سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ کپتان نے سر اٹھا کے اوپر دیکھا، ارغوانی بادبان خاموشی سے پھولے اور تنے ہوئے تھے اور ان کی

سیونوں میں دھوپ اودی اودی دھند کی طرح چمک رہی تھی۔ "سیکریٹ" ساحل چھوڑ کے سمندر میں آگے بڑھ رہا تھا۔ گرے کی مسرور روح کسی تذبذب کا شکار نہ تھی، اس میں نہ کسی تشویش کی اچھل کود تھی اور نہ ہی چھوٹی چھوٹی فکروں کی بھاگ دوڑ۔ وہ کسی بادبان جیسی پرسکون حالت میں لگن کے ساتھ اپنی جنت کی طرف بڑھ رہا تھا اور ذہن لفظوں پر سبقت لے جانے والے خیالوں سے معمور تھا۔

بحریہ کے ایک گشتی جہاز کے جھٹکے کے ساتھ نکلتے ہوئے دھوئیں کے بڑے بڑے مرغولے افق پر نمودار ہوئے۔ اس جہاز نے اپنا راستہ بدلا اور کوئی نصف میل کے فاصلے سے سگنل دئے جن کا مطلب تھا "ٹھہر جاؤ"۔

"وہ لوگ ہم پر گولاباری نہ کریں‌گے، ساتھیو" گرے نے کہا۔ "فکرمند نہ ہو! دراصل انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔"

اس نے جہاز کے ٹھہرنے کا حکم جاری کیا۔ پینٹن یوں چیخ چیخ کر جیسے آگ لگ گئی ہو، "سیکریٹ" کو ہواؤں سے الگ ہٹا لایا اور وہ ٹھہر گیا۔ اس اثنا میں گشتی جہاز سے ایک دخانی کشتی عملے اور سفید دستانوں والے لفٹیننٹ کے ساتھ تیزی سے ان لوگوں کی طرف چل دی۔ لفٹیننٹ نے جہاز پر چڑھ کے حیرت سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، گرے کے ساتھ اس کے کیبن میں گیا اور گھنٹے بھر بعد باہر نکلا تو چہرے پر یوں مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے ابھی ابھی اسے ترقی دے دی گئی ہو۔ اس نے رخصت ہونے کے لئے ہاتھ ہلایا اور اپنے نیلگوں گشتی جہاز کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرے کو اس بار صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی جتنی سیدھے سادے پینٹن کے سلسلے میں ہوئی تھی کیونکہ کچھ ہی دیر بعد گشتی جہاز نے سلامی کے طور پر توپوں کی زبردست باڑ سے افق کو چھلنی کر دیا۔ توپوں سے تیزی سے نکل کر دھوئیں کے بڑے بڑے تابناک مرغولے فضاؤں کو چیرتے ہوئے خاموش پانیوں پر بکھر گئے۔ گشتی جہاز پر تمام دن نیم جشنی افراتفری کا ماحول چھایا رہا۔ یہ مسرت یقیناً رسمی نہیں بلکہ احترام و استعجاب کی تھی اور محبت کے سائے میں جس کا چرچا افسروں کے طعام‌خانے سے لے کر انجن کے کمرے تک ہر جگہ گونج رہا تھا۔ تارپیڈو سیکشن میں ڈیوٹی پر مامور پہریدار نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ملاح سے پوچھا:

"ارے ٹام، تمہاری شادی کیسے ہوئی تھی؟"

"لڑکی نے کھڑکی سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس کا سایا پکڑ لیا" ٹام نے جواب دیا اور بڑے فخر سے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"سیکریٹ" کچھ دیر تک خالی سمندر میں چلتا رہا اور وہ ساحل سے نظر نہیں آتا تھا۔ دوپہر کے قریب ان لوگوں کو دوری پر ساحل دکھائی دیا۔ گرے نے دوربین اٹھا کے کپرنا پر نظریں جما دیں۔ چھتوں کی ایک قطار حائل نہ ہوتی تو اس نے ایک گھر کی کھڑکی کے پاس بیٹھی محو مطالعہ اسول کو دیکھ لیا ہوتا۔ ننھاسا

سبزی مائل بھونرا صفحے پر رینگ رہا تھا جو کبھی کبھی ٹھہر کے اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا تھا اور بہت ہی آزاد اور پالتو معلوم ہو رہا تھا۔ اسے دو بار جھلاھٹ کے ساتھ پھونک مار کے کھڑکی کی سل پر پہنچایا جا چکا تھا جہاں سے وہ اس اعتبار اور بےخوفی کے ساتھ واپس آ گیا تھا جیسے اسے کچھ کہنا ہو۔ اس بار وہ لڑکی کے عین ھاتھ تک پہنچ گیا جو کتاب کے ورق کا کونا پکڑے ہوئے تھا۔ اس جگہ وہ لفظ "دیکھو" پر اٹک کے رہ گیا، کچھ ھچکچایا جیسے نئے ڈانٹ ڈپٹ کا انتظار کر رہا ہو اور واقعی بچارا مصیبت میں گرفتار ہونے سے بال بال بچا کیونکہ اسول بڑبڑا اٹھی تھی: "اوہ! یہ... کمبخت کیڑا!" اور اسے پھونک مار کے سیدھے گھاس میں پہنچا دینے ہی کو تھی کہ اتنے میں اتفاقاً اس نے نظریں اٹھائیں جو ایک چھت سے دوسری پر منڈلاتی ہوئی آگے بڑھیں اور سڑک کے سرے کے بعد سمندر کی نیلگوں پٹی میں ارغوانی بادبانوں والے ایک سفید جہاز پر ٹھہر گئیں۔

وہ بری طرح چونک اٹھی، پیچھے جھکی اور مفلوج سی ہو گئی۔ پھر وہ اچھل کے کھڑی ہو گئی، اس کا دل بدحواسی سے ڈوبنے لگا اور اندرونی تحریک سے پیدا ہونے والے صدمے کے ناقابل ضبط آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ اس اثنا میں "سیکریٹ" ایک چھوٹے راس کا چکر لگا رہا تھا، اس کے پہلو کے دروازے والا حصہ ساحل کی طرف تھا اور ارغوانی ریشم کے سائے میں عرشے پر سے آتی ہوئی دھیمی دھیمی موسیقی ھلکی نیلگوں وادی پر تیر رہی تھی۔ یہ خوش‌الحانی سے گائے ہوئے شیریں نغمے کی موسیقی تھی جس کا ان مشہور لفظوں میں بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ اظہار نہیں ہو سکا: "اپنے اپنے جام بھر لو — آؤ محبت کے نام پر پئیں..." اس موسیقی کی سادگی میں نشاط و انبساط سے معمور جوش و خروش لہرا رہا تھا، بل کھا رہا تھا۔

اسول یہ پروا کئے بغیر کہ اس نے گھر کو کس حال میں چھوڑا ھے، واقعات کی ناقابل مزاحمت آندھی میں پھنس کر سمندر کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ پہلے ہی موڑ پر ٹھہر گئی کیونکہ اس کی قوت تقریباً جواب دے چکی تھی، گھٹنے خم ہو گئے تھے، ھانپ ھانپ کے سانس لے رہی تھی اور ہوش کی حدیں بےہوشی سے مل جانے کو تھیں۔ اپنے عزم کو کھو بیٹھنے کے اندیشے سے بدحواس ہو کر اس نے زمین پر زور زور سے پاؤں مارے اور ایک بار پھر دوڑ پڑی۔ کبھی کبھی کوئی چھت یا جنگلا اس کی نگاھوں سے ارغوانی بادبانوں کو اوجھل کر دیتا تھا اور تب وہ اس ڈر سے کہ کہیں بادبان معمولی سراب کی طرح غائب نہ ہو جائیں، اذیت‌دہ رکاوٹ سے آگے بڑھنے کے لئے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دیتی اور جہاز دوبارہ نظر آنے لگتا تو ٹھہر کے اطمینان کی سانس لیتی۔

اس دوران کپرنا میں ھلچل مچ گئی تھی، گاؤں چیخ پکار سے گونج اٹھا تھا اور ایسی سنسنی پھیل گئی تھی جو مشہور زلزلوں کے اثرات کی یاد دلا رہی تھی۔

اتنا بڑا جہاز اس ساحل پر کبھی آیا ہی نہیں تھا اور اس پر طرہ یہ کہ اس کے بادبان بھی وہی تھے جن کا رنگ طعنے جیسا لگتا تھا۔ اب یہ بادبان پوری آب و تاب سے ناقابل تردید طور پر کسی ایسے واقعے کی معصومیت کے ساتھ جگمگا رہے تھے جو زندگی اور عقل سلیم کے تمام قوانین کو غلط قرار دیتا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے بدحواسی سے ساحل کی طرف دوڑے چلے جا رہے تھے، لوگ اپنے گھروں کے جنگلوں کے اوپر سے چلا چلا کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور چیخیں مارتے ہوئے گر گر پڑتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کے بالکل قریب خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی اور اسی بھیڑ میں اسول تیزی سے داخل ہوئی۔

جب تک وہ وہاں نہیں پہنچی تھی تب تک اس کا نام بےچینی اور بیزاری بھرے تناؤ سے، حقارت بھرے خوف سے ادھر ادھر اچھالا جا رہا تھا۔ زیادہ باتیں مرد ہی کر رہے تھے۔ عورتوں پر تو جیسے بجلی گر پڑی تھی، وہ دبی دبی، سانپ کی جیسی پھنکاروں کے ساتھ سسکیاں بھر رہی تھیں لیکن اگر ان میں سے کوئی قینچی کی طرح زبان چلانا شروع کر دیتی تھی تو زہر اس کے سر تک پہنچ جاتا تھا۔ اسول کے نمودار ہوتے ہی ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا، ہر شخص خوف‌زدہ ہو کے اس سے دور ہٹ گیا اور وہ تپتی ہوئی ریت کی پٹی پر تنہا رہ گئی، بالکل بوکھلائی ہوئی، نادم اور مسرور؛ اس کا چہرہ اس کے معجزے ہی کی طرح ارغوانی تھا اور س کے ہاتھ بےبسی کے ساتھ بلند جہاز کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔

ایک کشتی جسے دھوپ سے سونلائے ہوئے ملاح پتواروں سے چلا رہے تھے، جہاز سے الگ ہو کے ساحل کی طرف چلی۔ ملاحوں کے درمیان وہ شخص کھڑا تھا جسے اب اسے محسوس ہوا کہ وہ جانتی تھی اور جو اسے بچپن ہی سے کچھ کچھ یاد تھا۔ وہ اسول کی طرف ایسی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا جو گرمجوشی بخش رہی تھی، اشاروں سے بلا رہی تھی۔ لیکن عین وقت پر پیدا ہونے والے ہزاروں احمقانہ اندیشوں نے اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ کسی غلطی یا غلط‌فہمی، کسی پراسرار یا بد رکاوٹ — ہر شے کے خوف سے بےجان ہو کر اس نے چھلانگ لگائی اور لہریں لیتے ہوئے گرم پانی میں کمر کی گہرائی تک اتر کے زور سے پکارا:

"میں یہاں ہوں، میں یہاں ہوں! یہ میں ہوں!"

تب زیمر نے اپنے کمانچے کو اٹھایا اور اسی نغمے نے ہجوم کو مسحور کر دیا لیکن اس بار یہ کثیر صوتی، فاتحانہ نغمہ تھا۔ لڑکی اپنے جوش و خروش، بادلوں اور لہروں کی حرکات، پانی کی چمک اور دوری کی بنا پر بمشکل ہی دیکھ پا رہی تھی کہ دراصل متحرک کیا ہے: وہ خود، جہاز یا کشتی۔ اسے ہر شے متحرک، گھومتی اور گرتی معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن اس کے پہلو میں پتوار کی چھپ چھپ کی آواز ابھری اور اس نے سر اٹھایا۔ گرے جھکا اور اسول کے ہاتھوں نے مضبوطی سے اس کی پیٹی پکڑ لی۔ لڑکی

نے اپنی آنکھیں بھینچ کے بند کر لیں پھر انہیں تیزی سے کھولا، گرے کے چہرے کو جو کھل اٹھا تھا، بےباک مسکراھٹ کے ساتھ دیکھا اور ھانپتے ہوئے کہا:

"بالکل ویسے ہی جیسے کہ میں نے اپنے تصور میں دیکھا تھا۔"

"اور تم، تم بھی ویسی ہی، میری جان!" گرے نے اپنی بھیگی ہوئی دولت کو پانی سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آخرکار میں آ گیا۔ تم مجھے پہچان رہی ہو نا؟"

اس نے گرے کی پیٹی پکڑے پکڑے، نیا جنم پانے والی روح کے ساتھ کانپتے ہوئے، آنکھیں بند کئے کئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے سینے میں مسرت بلی کے نرم نرم سمٹے سمٹائے بچے کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ آخرکار جب اسول نے آنکھیں کھولیں تو کشتی کی جنبشیں، لہروں کی چمک دمک اور "سیکریٹ" کا قریب آتا ہوا زبردست متحرک پہلو، سب کچھ ایک خواب جیسا معلوم ہوا جس میں روشنی اور پانی اس طرح رقصاں و گرداں تھے جیسے دھوپ سے دھاریدار ہو جانے والی کسی دیوار پر آفتاب کے داغ مرتعش ہوں۔ اسے یاد نہیں تھا کہ گرے کس طرح اسے اپنے طاقتور بازوؤں پر اٹھا کے جہاز کے اوپر لے گیا۔ قالینوں سے سجا اور ڈھکا ہوا، بادبانوں کی ارغوانی پرچھائیوں سے گھرا ہوا عرشہ کسی فردوسی باغ جیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اور جلد ہی اسول نے دیکھا کہ وہ ایک کیبن میں، ایک کمرے میں پہنچ گئی ہے جس سے بہتر جگہ کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تب عرشے پر گرج دار موسیقی دل کو پاش پاش اور اپنی فاتحانہ پکار میں ضم کرتی ہوئی ایک بار پھر گونج اٹھی۔ ایک بار پھر اسول نے اس ڈر سے آنکھیں بند کر لیں کہ وہ دیکھےگی تو سب کچھ غائب ہو جائےگا۔ گرے نے اس کا ھاتھ تھام لیا اور اسول نے اب یہ جانتے ہوئے کہ اس کی جائے پناہ کہاں ہے، اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے محبوب کے سینے میں چھپا لیا جو معجزے کی طرح نمودار ہو گیا تھا۔ گرے نے بہت دھیرے سے لیکن مسکراھٹ کے ساتھ کیونکہ وہ بھی ناقابل بیان اور بیش‌بہا لمحے کی آمد سے جو کسی اور کی رسائی سے باھر تھا، بالکل بےقابو اور ھکا بکا ہو کے رہ گیا تھا، اس چہرے کو اوپر اٹھایا جو عرصے سے اس کے خیالوں میں بسا ہوا تھا اور لڑکی نے آخرکار آنکھیں کھول دیں۔ کسی شخص میں جو کچھ بہترین ہو سکتا تھا وہ سب کا سب ان آنکھوں میں موجود تھا۔

"میرے والد لونگرین کو بھی آپ ساتھ لے چلیں‌گے؟" اس نے پوچھا۔

"ھاں" اور گرے نے زوردار لہجے کی اس "ھاں" کے بعد جذبات کی ایسی شدت سے اس کا بوسہ لیا کہ وہ کھلکھلا کر ھنس پڑی۔

اب ہمیں ان دونوں کو تنہا چھوڑ دینا چاھئے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انہیں تنہائی کی ضرورت ہے۔ دنیا کی بہت سی زبانوں اور بولیوں میں جانے کتنے ہی الفاظ ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی لفظ اس کی ادنی سی جھلک تک نہیں پیش کر سکتا جو کچھ انہوں نے اس روز ایک دوسرے سے کہا۔

اس اثنا میں عرشے پر بڑے مستول کے قریب سارا عملہ کرم خوردہ چوبی پیپے کے گرد منتظر تھا جس کا ڈھکن کھول دیا گیا تھا اور سو سال پرانی نہایت ہی شاندار سیاہی مائل شراب چھلکنے لگی تھی۔ ایٹ‌ووڈ پیپے کے پاس کھڑا تھا اور پینٹن وضع قطع کی رسمی پابندیوں کے ساتھ کسی نوزائیدہ بچے جتنا خوش و خرم بیٹھا تھا۔ گرے نے عرشے پر پہنچ کر آرکسٹرا کو اشارہ کیا، ٹوپی اتاری اور سنہری نفیریوں کی آوازوں کی گونج میں سب سے پہلے اس پرانی شراب میں گلاس ڈبویا۔

"یوں..." اس نے گلاس کو خالی کر کے نیچے اچھالتے ہوئے کہا۔ "اب پینا شروع کرو۔ سب لوگ پئیں! جو نہیں پیتا وہ میرا دشمن ہے۔"

اسے اپنے الفاظ کی تکرار نہ کرنی پڑی۔ "سیکریٹ" پوری رفتار سے، پوری طرح کھلے ہوئے بادبانوں کے ساتھ کپرنا سے جہاں کے لوگوں کو متحیر کر کے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا تھا، دور جا رہا تھا تو پیپے پر لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے اور بڑی بڑی ضیافتوں سے بھی زیادہ چھینا جھپٹی دیکھنے میں آ رہی تھی۔

"کہو بھئی، کیسی لگی؟" گرے نے لتیکا سے پوچھا۔

"کپتان" ملاح نے صحیح الفاظ تلاش کرتے ہوئے کہا، "مجھے نہیں معلوم کہ اسے میں کیسا لگا لیکن مجھے اپنے تاثرات پر غور کرنا پڑےگا۔ شہد کا چھتا اور پھلوں کا باغ!"

"کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اسے پینا ایسا ہی تھا جیسے شہد کا ایک چھتا اور پھلوں کا ایک باغ میں نے منھ میں رکھ لیا ہو۔ خوش رہئے، کپتان۔ اور وہ بھی جسے میں «بہترین مال»، «"سیکریٹ" کی بہترین دولت» کہوں‌گا، مسرتوں سے ہم‌کنار ہو!"

اگلی صبح کو جہاز کپرنا سے کافی دور نکل چکا تھا۔ عملے کے کچھ لوگ گرے کی شراب سے بےقابو ہو کر عرشے ہی پر لیٹ گئے تھے اور وہیں ابھی تک محو خواب تھے۔ صرف جہازراں، پہریدار اور متفکر اور مخمور زیمر ہی جو جہاز کے اگلے ابھار کے قریب اپنے وائلن چیلو کے فنگر بورڈ پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا ہوا تھا، جاگ رہے تھے۔ وہ تاروں پر دھیرے دھیرے کمانچہ پھیر رہا تھا جو مسحورکن آسمانی آواز سے بول رہے تھے اور سوچ رہا تھا مسرت کے بارے میں...

۱۹۲۰ء — ۱۹۲۱ء

سانپ

«نیڈ گارلین کے ورثا» جیسا کہ واقف‌کاروں نے مذاق میں ان کا نام رکھ دیا تھا، دراصل سات نوجوان طلبا اور طالبات گارلین کی جس کا تپ‌دق سے سوئٹزرلینڈ میں انتقال ہو گیا تھا، دی ہوئی موٹر بوٹ کے مشترک مالک تھے۔

وسط جولائی میں یہ لوگ اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوئے۔ منزل تھی جھیل اسنارک کا ساحل اور مقصد "ویرانے میں رہائش"۔

ایک آٹھویں نوجوان کولبرٹ کو بھی مدعو کر لیا گیا تھا جس کی سفر میں شریک تین لڑکیوں میں سے ایک — جوائے ٹیویس — سے یک طرفہ محبت کا قصہ سال بھر پہلے ساری یونیورسٹی میں گونج اٹھا تھا اور اس پر خوب خوب چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔

جوائے ٹیویس سولہ سال کی عمر سے اب تک زخم پر زخم ہی لگاتی چلی آ رہی تھی اور چونکہ وہ انہیں اچھا کرنا نہیں جانتی یا نہیں چاہتی تھی اس لئے یہ زخم کسی طبی امداد کے بغیر خود بخود کافی تیزی سے اچھے ہو جایا کرتے تھے۔ کولبرٹ البتہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سنگین طور پر زخمی ہوا تھا اور وہ اسے چھپاتا بھی نہیں تھا۔

اس نے تین بار جوائے کے سامنے شادی کی تجویز رکھی تھی اور جوائے نے بھی تین ہی طرح کے رد عمل ظاہر کئے تھے۔ پہلا تو قہقہہ تھا، دوسرا "دوستوں کے جیسے تعلقات" قائم رکھنے کا اشارہ اور آخری کھلا ہوا تنفر۔ وہ کولبرٹ کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے ان طویل قامت، سنجیدہ نوجوانوں سے ڈر سا محسوس ہوتا تھا جو اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور شکستہ دل مریض محبت بن کے رہ جاتے تھے۔ ایسے انتہائی صبر و ضبط والے کسی شخص کے اس کا شوہر بن بیٹھنے کے محض تصور ہی سے وہ اس غیرمرئی دباؤ کے خلاف جو اسے اس قسم کے جنجال میں زبردستی پھنسا دے، بھیانک انتقامی غصے سے بھڑک اٹھتی تھی۔

لیکن کولبرٹ نے خود کو اس کے لئے وبال جان نہ بنایا اسی لئے وہ اس سے کتراتی بھی نہیں تھی مگر پہلے اس سے یہ وعدہ ضرور لے لیا تھا کہ آئندہ کبھی شادی کا نام بھی زبان پر نہ لائےگا۔ کولبرٹ نے اس حکم کی پوری پوری تعمیل کی

اور ایسا طرز عمل اپنایا جیسے اس نے جوائے کو کبھی ان سیدھے سادے الفاظ سے پریشان ھی نہ کیا ہو: "میری شریک حیات بن جاؤ، جوائے!"

"ویرانے میں رھائش" کے تیسرے روز جوائے کو دشت نوردی کی سوجھی اور اس نے کولبرٹ کو اپنی رفاقت کے لئے اس موہوم سی امید کے ساتھ مدعو کیا کہ کوئی ایسی بات ہوگی جس سے کولبرٹ کا کبھی شادی کی درخواست نہ کرنے کا اٹوٹ عہد ٹوٹ جائے گا۔ دراصل جوائے سے گزشتہ تین مہینوں کے دوران کسی نے محبت کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ وہ کسی ایسے چھوٹے سے واقعے کے لئے تڑپ رھی تھی جو اس کے دل پر محبت کی یاد دلانے والی کوئی بےضرر سی کیفیت طاری کر دیتا، بس چند ھی لمحوں کے لئے۔ کولبرٹ اس کے پیچھے پیچھے چل رھا تھا تو وہ محسوس کر رھی تھی کہ اس کے عقب میں کوئی ایسی دیوار بڑھتی چلی آ رھی ھے جو بزدلی کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو جانے کی آرزومند ھے۔ اسے صرف صحیح لمحے کا اندازہ لگا کر ایک طرف ھٹنا اور دیوار کو کھلی زمین پر گر جانے دینا تھا۔

چلتے چلتے وہ دونوں جنگل میں ایک کھلی جگہ پر پہنچے جہاں اونچی اونچی گھاس اگی تھی اور بڑے بڑے پتھر پڑے تھے جن پر بیٹھ کر اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔

کولبرٹ نے کہا کہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انہیں واپس لوٹ جانا چاھئے۔

"کیا آپ خوش ھیں کہ میرے اور آپ کے بیچ اب کوئی پیچیدگی نہیں رھی؟" جوائے نے ذرا دیر تک خاموش رھنے کے بعد پوچھا۔

"اس مسئلے پر تو میں سمجھتا ہوں کہ مکمل طور پر بات چیت ہو چکی ھے" کولبرٹ نے اس شک سے جو بہرحال بےسبب نہ تھا کہ اس کے لئے جال بچھایا جا رھا ھے، محتاط انداز میں جواب دیا۔ "میں آپ کو زبان دے چکا ہوں۔ لیکن اگر..."

"نہیں" جوائے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو منع کر چکی ہوں اور آپ مجھ سے عہد کر چکے ھیں۔ یقیناً آپ اپنا وعدہ نہیں توڑنا چاھتے نا؟"

"میں جان دے دینا پسند کروں گا" کولبرٹ نے فوراً ھی سنجیدگی سے جواب دیا، "لیکن آپ سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ "آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

جوائے نے جھنجلا کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھا ہوا ایسی فرماں‌برداری اور اداسی کے ساتھ مسکرا رھا تھا کہ جوائے کی جھنجلاھٹ شدید غصے میں بدل گئی۔ اس کی چال ناکام ہو گئی تھی۔

اور آگے بڑھنے کا مطلب خود کو مضحکہ خیز حالت میں پیش کرنا ہوتا۔ ذرا دیر تک وہ اب بھی اس امید کا دامن تھامے رھی کہ کولبرٹ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے گا، دھڑ سے کچھ نہ کچھ کہہ گزرے گا لیکن وہ تو اداسی کے ساتھ گھاس کے ایک تنکے کو اپنی ھتھیلیوں کے درمیان رگڑتا رھا اور بس۔ اچانک جوائے کو احساس ہوا کہ یہ شخص اپنے سارے طرز عمل سے، اپنے عزم اور سختی سے اسے سبق سکھا

رہا ہے اور اس کے دل میں کولبرٹ کے خلاف عداوت کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ وہ خود کو طنزیہ لہجے میں یہ تک کہنے سے باز نہ رکھ سکی:

"آپ نے زبان جو دی تھی نا تو محض بزدلی سے۔ خاموش بیٹھے رہنے میں کوئی خطرہ نہیں مول لینا پڑتا، ہے نا؟"

"جوائے" کولبرٹ نے تشویش کے ساتھ کہا۔ "ضرور آپ پر گرمی نے اثر کیا ہے۔ ہمیں واپس چلنا چاہئے، وہاں آپ چھاؤں میں بیٹھ سکیں گی!"

جوائے کھڑی ہو گئی۔ اچانک اس کا جی چاہا کہ کولبرٹ کے گھنے بادامی بالوں کو پکڑے اور اس کند ذہن سر کو جھنجوڑ کے رکھ دے جو چال کا مفہوم نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ جوائے کے اس عارضی جذبے کی رو میں خود بھی بہہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی برا مان گئی، شدید جھنجلاھٹ سے ہونٹ چباتے ہوئے اپنے قدموں کے نیچے زمین کو تکنے لگی۔ اسے سرسراتی ہوئی گھاس میں کسی چیز کی چمک نظر آئی۔

"دیکھئے، چھپکلی!"

وہ کولبرٹ کے دھکے سے گرتے گرتے بچی۔ ڈگمگا جانے کے بعد اس نے بہ دقت خود کو سنبھال لیا۔ اس اثنا میں کولبرٹ بازو لہرا لہرا کر کسی چیز کو گھاس میں روندنے لگا۔ پھر اس نے بیٹھ کے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک چھوٹے سے سانپ کو وسطی حصے سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی انگلیوں پر سانپ کے دونوں سرے یعنی منھ اور دم نیچے لٹکنے لگے۔

"آپ نے اسے دیکھا تھا؟" اس نے جوائے کے آگ بگولا چہرے کو دیکھتے ہوئے تشویش کے ساتھ کہا۔ "میں نے آپ کو زور سے دھکا دے دیا جس کے لئے معافی چاھتا ہوں۔ کانسے کے رنگ کا سانپ ہے! انتہائی خطرناک سانپوں میں سے ایک! عورتیں تو تقریباً ہمیشہ ہی سانپوں کو چھپکلیاں سمجھ بیٹھتی ہیں۔ یہ کسی کو ڈس لے تو بس تین ہی منٹوں میں کام تمام سمجھئے۔"

جوائے کچھ اور قریب آ گئی۔

"مر گیا؟"

"ھاں" کولبرٹ نے سانپ کو نیچے گرا کر دوبارہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

جوائے کے خیال میں مردہ سانپ کو اٹھانا بڑا دل گردے کا کام تھا اور وہ نہیں چاھتی تھی کہ کولبرٹ سبقت لے جائے۔ چنانچہ اس نے کولبرٹ سے سانپ کو لے کر اپنی بائیں کلائی میں یوں لپیٹ لیا کہ کنگن سا بن گیا۔ اب یہ ننھا سا سانپ جو کولبرٹ کی ایڑی سے کئی جگہ پچی ہو گیا تھا، جوائے کی سانولی جلد پر کہیں کہیں پرانے سونے کے جیسے رنگ کا معلوم ہو رہا تھا۔

"اسے پھینک دیجئے، پھینک دیجئے!" اچانک کولبرٹ چیخ اٹھا۔

اسے یہ بتانے کا وقت ہی نہ مل سکا کہ سانپ کے مردہ جسم میں بمشکل ہی نظر آنےوالا تشنج پیدا ہوا تھا۔ اس میں ایک لمحے کے لئے جان پڑ گئی تھی اور

اس نے انسانی ہاتھ کی اجنبی حرارت کو محسوس کر کے منہ کھولا اور جوائے کے ہاتھ کو ڈس لیا تھا۔ یہ کوشش اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ کولبرٹ نے جلدی سے سانپ کے سر کو پکڑ کر اتنا کچلا کہ یہ پھٹ گیا۔ پھر اس نے سانپ کے جسم کے باقی حصے کو جوائے کی کلائی سے الگ گرایا اور تب اسے خون کے دو قطرے نظر آئے۔ ان قطروں کا مفہوم اس کے لئے کچھ یوں واضح تھا جیسے کسی نے چیخ کر بتایا ہو۔

"بدحواس نہ ہو جائیےگا!" اس نے جوائے سے کہا۔ "یاد رکھئے، موت سر پر کھڑی ہے!"

کولبرٹ کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی جس پر اس نے قابو پانے کی کوشش کی۔ جوائے بےبسی کے ساتھ اپنی کلائی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے درد اور کراہت کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کا تخیل کولبرٹ کے تخیل کی جیسی تیزی سے نہیں کام کر رہا تھا اور آخری گھڑی آن پہنچنے کے احساس نے ابھی اس کے ہوش نہیں غائب کئے تھے۔ لیکن کولبرٹ کی عجلت اور اس کے احکام نے جوائے کو اپنی ساری آزادی کا مالک بنا دیا جسے اس عظیم خدمت سے جو کولبرٹ انجام دینے جا رہا تھا، خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

"مجھے چھوڑ دیجئے" وہ دشواری سے سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں یہ کام خود ہی کر لوں‌گی۔ چاقو لائیے۔"

ایسے لمحات میں وقت زندگی سے بھی بیش قیمت ہوتا ہے۔ کولبرٹ نے چاقو کھول کر لڑکی کو نیچے گرانے کی کوشش کی تاکہ متاثرہ جگہ پر جلد کو کاٹ سکے۔ اسی وقت اس نے اپنے مسوڑوں اور تالو پر یہ دیکھنے کے لئے جلدی جلدی زبان بھی پھیری کہ منہ میں کوئی خراش تو نہیں ہے۔

"زہر کو چوس کے باہر نکالنا ہے! اور کوئی چارہ‌کار ہی نہیں! جوائے، بحث نہ کیجئے!"

وہ دانت پیس پیس کر خاموشی سے کولبرٹ کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ عجیب و غریب غصے اور ہیجان کے زیر اثر وہ کولبرٹ کے ہاتھوں زندگی پانے پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کو ترجیح دے رہی تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ کولبرٹ کے اس احسان سے اس پر کیا ذمےداری عائد ہو جائےگی۔ کولبرٹ کو اسے اپنی شریک حیات بنا لینے کا ایک موقع مل گیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو لفظوں کے بغیر، خیالوں کے بغیر کسی اندرونی تحریک کے ذریعے سمجھ گئی تھی اور کولبرٹ کی بانہوں سے نکل آنے کے لئے سخت جد و جہد کر رہی تھی۔ آخرکار کولبرٹ آپے سے باہر ہو کر اسے گھسیٹتا ہوا ایک درخت کے پاس لے گیا جس کا تنا بیچ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کے بازو کو خالی جگہ کے اندر زبردستی داخل کر دیا جس سے کہیں کہیں کھال تک چھل گئی۔ پھر اس نے دوسری طرف جا کے جوائے

کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور اس طرح اس کا بازو ایک طرح کے شکنجے میں جکڑ گیا۔

کولبرٹ نے اس بازو کو جو اس سے شدید نفرت کرتا تھا، کہنی کے پاس پکڑ کے دبایا، اتنے زور سے دبایا کہ اس کی غیر معمولی قوت نے جوائے کے ناخنوں کو نیلا کر دیا۔ پھر اس نے سانپ کے کاٹنے کی جگہ پر چاقو سے گہرا سا زخم بنا کر اس پر اپنے ہونٹ رکھے اور منہ خون سے بھر لیا۔ اس نے اس خون کو زمین پر تھوک دیا، دوسری بار بھی ایسا ھی کیا اور پھر ذرا دم لے کر تیسری بار خون کو پی گیا، اس لڑکی کے خون کو جس پر وہ جان دیتا تھا۔ جوائے اپنے بازو کو دو بار جھٹکنے کے بعد آخر کار پرسکون ہو گئی تھی اور درخت کے دوسرے پہلو سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ خوف، تذلیل اور غصے نے اس کے چہرے کو آنسوؤں سے تر کر دیا تھا۔ وہ بار بار کہے جا رہی تھی:

"کولبرٹ، اس کے باوجود میں کبھی بھی آپ کی بیوی نہ بنوں‌گی۔ مجھے چھوڑ دیجئے!"

کولبرٹ خاموش تھا۔ آخرکار جوائے کا ہاتھ چھوڑنے کے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ھے اور جواب دیا:

"آپ کسی نہ کسی کی بیوی تو بنیں‌گی ھی، یہ ھے خاص بات۔ اور بیوی بننے کے لئے ضروری ھے کہ آپ زندہ رھیں۔"

اس کی مونچھوں اور ٹھوڑی میں خون بھرا ہوا تھا اور انہیں اس نے جس ہاتھ سے پونچھا وہ بھی خون سے سرخ تھا۔

جوائے نے افسردگی کے ساتھ اپنے زخمی بازو کو پھیلایا اور کٹی ہوئی جگہ پر رومال رکھ دیا۔ وہ دونوں ھانپ رھے تھے جیسے بہت دور تک دوڑتے رھے ہوں۔ آخر جوائے نے رومال کو پھاڑ کے پٹی باندھی۔ کولبرٹ اپنی گھڑی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"پانچ منٹ گزر چکے ھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب سب ٹھیک ھے۔"

جوائے نے جو اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی، کوئی جواب نہ دیا۔ پھر جب وہ مڑی تو کولبرٹ وھاں سے غائب تھا۔

اس نے حیرت‌زدہ ہو کے پکارا: "کولبرٹ!" پھر جوائے جس نے کولبرٹ کو اب بھی معاف نہیں کیا تھا اور جو اب بھی اپنی اسی اندرونی مزاحمت کے قابو میں تھی جس پر کولبرٹ بالآخر فتح‌یاب ہو گیا تھا، روندی ہوئی گھاس پر قدموں کے نشانات کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھی، جھاڑیوں میں جھانکا اور ٹھہر گئی۔

کولبرٹ پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا، چہرہ سیاہ پڑ چکا تھا، سوج گیا تھا۔ وہ بالکل ھی مختلف آدمی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھول گئی تھیں اور مونچھوں اور

منہ سے جن میں جوائے کا خون بھرا ہوا تھا، وہ ساری آفت جھانک رہی تھی جس سے اس نے اپنی محبوبہ کو بچا لیا تھا۔ اس مکروہ، زہر سے متاثر چہرے نے آخرکار جوائے پر ہول طاری کر دیا کیونکہ اس نے خود اپنی موت کو جس کا خطرہ اب ٹل چکا تھا، اس کی ساری ہیبت‌ناکی کے ساتھ دیکھا اور چیختی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی: "بچاؤ، میں مر رہی ہوں!"

لیکن بہت تاخیر ہو چکی تھی کیونکہ اس کی جان تو بچائی[۱] جا چکی تھی۔

۱۹۲۶ء

والد کا عتاب

بیرینگ طویل سفر سے واپس ہونے ہی کو تھا کہ اس کے بیٹے، کم‌سن ٹام جیرینگ کو اپنی پھوپھی کارنیلیا اور پھوپھا کارل کے حملے کا شکار ہونا پڑا۔

ٹام نیم تاریک کتب خانے میں صابن کے بلبلے اڑاتے پکڑا گیا تھا۔ ویسے تو وہ اس سے کہیں زیادہ سنگین جرائم مثلاً زرد پردے کو کلاں نما شیشے سے جلا کر اس میں ایک سوراخ کر دینے، "ڈی کیمرون" کی تشریحی تصویروں کو دیکھنے اور ایک پڑوسی کے بیٹے سے ھاتھا پائی کرنے کا مرتکب ہو چکا تھا پر صابن کے ان بلبلوں نے کارنیلیا کو خاص طور سے بوکھلا دیا۔ اس بڑے سے گھر میں جہاں سب کچھ بندھے ٹکے اصولوں کے مطابق ہی ہوتا تھا، اس قسم کی بیہودگی برداشت نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پھوپھا کارل نے بڑے گمبھیر انداز میں صابن کے جھاگ کی پلیٹ ضبط کر لی اور پھوپھی کارنیلیا نے شیشے کی نلکی۔

کارنیلیا نے شیطان کی آنت جیسی لعنت ملامت میں ٹام کو شرارتی لڑکوں کے المناک مقدر سے خبردار کیا: یہ جرائم پیشہ بن جاتے ھیں یا پھر آوارہ گرد۔ آخرکار اس نے اپنے وعظ کی تان یوں توڑی:

"ارے لڑکے، اپنے والد کے عتاب کی فکر کر! میرے بھائی نے گھر میں قدم رکھا نہیں کہ میں تیرا سارا کچا چٹھا کہہ سناؤں‌گی اور پھر دیکھنا کہ ان کا عتاب تجھ پر کیسی قیامت ڈھاتا ہے۔"

اور اس کے پھوپھا کارل نے جو کولھوں پر ھاتھ رکھ کے جھک گیا تھا، اضافہ کیا:

"بڑا بھیانک ہوگا یہ عتاب۔"

یہ دونوں باھر چلے گئے تو ٹام بازودار اونچی کرسی پر جا بیٹھا اور تصور کرنے کی کوشش کی کہ اس پر کیا مصیبت نازل ہونےوالی ہے۔ یہ تو سچ تھا کہ کارل اور کارنیلیا کو بھاری بھرکم لفاظی کا بڑا شوق تھا لیکن باپ کے اس "عتاب" کا بار بار ذکر آنے سے بچارے ٹام کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ پھوپھی یا پھوپھا سے یہ پوچھنے کا کہ آخر عتاب کس بلا کا نام ہے، مطلب خود کو بزدل ظاہر کرنا ہوتا۔ ٹام نہیں چاھتا تھا کہ ان دونوں کو یہ اطمینان حاصل ہو۔

ذرا دیر تک سوچنے کے بعد ٹام کرسی سے اترا اور بڑے وقار سے چلتا ہوا اس امید کے ساتھ باغ میں گیا کہ وہاں اس معمے کو حل کرنے والا کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔

ادیب اور کارنیلیا کا رشتےدار آسکر مونک شاہبلوط کے ایک درخت کے نیچے لیٹا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔

ٹام قدیم امریکی باشندوں کے انداز سے بالکل چپ چاپ، دبے پاؤں اس کے قریب پہنچ کر زور سے چلایا:

"اوف!"

مونک نے اخبار رکھ کر لڑکے کے گھٹنے پکڑے اور اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اوری‌نوکو میں صورت حال پرسکون ہے" اس نے کہا۔ "هوران گیاھستان کو جا چکے ہیں۔"

لیکن ٹام اپنی پریشانی کی بنا پر اس کھیل میں شریک نہ ہو سکا۔

"آپ جانتے ہیں کہ عتاب کیا ہوتا ہے؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔ "دیکھئے، کسی سے کہئےگا نہیں کہ میں نے اس کے متعلق آپ سے کچھ پوچھا تھا۔"

"عتاب؟"

"جی ہاں، والد کا عتاب۔ وہ کل آ رہے ہیں اور عتاب کو بھی اپنے ساتھ لائیں گے۔ پھوپھی ان سے میرے بلبلے اڑانے، پردے میں سوراخ کر دینے کے بارے میں الٹی سیدھی لگائیں گی۔ یہ سوراخ تو بالکل ذرا سا تھا لیکن میں... نہیں چاہتا کہ عتاب کو اس کی خبر ہو۔"

"اچھا تو یہ بات ہے!" مونک نے زوردار قہقہہ لگایا جسے ٹام سمجھ تو نہ سکا لیکن اس کی وجہ سے اسے تین قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔ "ہاں بھئی، تمہارے والد کا عتاب واقعی اچھا نہیں۔ یہ تو دیو ہے اور وہ بھی ایسا کہ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ چار تو اس کے ہاتھ ہیں اور چار ہی پاؤں۔ دوڑنے میں ہوا سے باتیں کرتا ہے۔ بھینگی بھینگی آنکھیں۔ ناک پر غصہ۔ نہ پوچھو کیسا بھیانک ہے۔"

ٹام پریشان ہو کر پیچھے ہٹا اور بوکھلاہٹ سے مونک کو تکنے لگا جو ایسے بھیانک درندے کی وضع قطع اتنے پرمسرت لہجے میں بیان کر سکتا تھا۔ اب اس کے دل میں کسی اور سے کچھ پوچھنے کی خواہش نہ باقی رہی، کچھ دیر تک سایہ‌دار راستوں پر منڈلاتا رہا یہاں تک کہ اسے پڑوس‌والے گھر کی آٹھ سالہ لڑکی مولی دکھائی دی۔ وہ اپنی بپتا سنانے کے لئے دوڑا لیکن مولی اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ دراصل اس کے ٹام کے ساتھ کھیلنے پر اسی دن سے پابندی لگا دی گئی تھی جب دونوں نے مل کر پود گھر کے شیشوں پر تیر برسائے تھے۔ سرغنہ، جیسا کہ ایسے واقعات میں عموماً ہوتا ہی ہے، ٹام کو تصور کیا گیا تھا حالانکہ ٹام کو اکسایا تھا مولی نے کہ ذرا کھڑکی پر نشانہ لگانے کی کوشش کر کے تو دیکھو۔

گھنگرالے بالوں‌والی اس دبلی پتلی لڑکی سے پرستش کی حد تک محبت کے جذبات سے بےقابو ہو کر ٹام نے سیدھے جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی، چہرے پر بری طرح کھرونچے پڑ گئے پھر بھی وہ لڑکی کو جا لینے میں ناکام رہا۔ مجبوراً اس نے درد و غم کے آنسو آنکھوں سے پونچھ ڈالے اور گھر کے اندر لوٹ آیا۔

خادمہ میز پر ناشتہ لگا کر باہر چلی گئی۔ ٹام کو سنہری شراب سے بھری ہوئی شیشے کی صراحی دیکھتے ہی یاد آیا کہ کپتان کیڈ (کتاب "ساحلی قزاق" والے) کو ایک ریگستانی جزیرے پر مکمل اور مکروہ تنہائی میں رم پینی پڑی تھی۔

ٹام کپتان کیڈ کو بہت پسند کرتا تھا اس لئے اس نے میز پر چڑھ کے شراب سے گلاس بھرتے ہوئے منہ ہی منہ میں کہا:

"آپ کی صحت کے لئے، کپتان۔ میں آپ کو بچانے کے لئے اسٹیمر پر یہاں پہنچا ہوں۔ فکر نہ کیجئے، ہم آپ کی بیٹی کو ڈھونڈ نکالیں گے۔"

ٹام نے شراب کا ایک گھونٹ ہی حلق سے اتارا تھا کہ کارنیلیا اندر آ گئی۔ اس نے اس "شرابی" کو کرسی سے اتارا اور خاموشی لیکن خوش اخلاقی سے تین تھپڑ مقررہ جگہ پر رسید کر دئے۔ پھر آگ بگولا بڑھیا نے حلق سے باریک چیخ نکالی اور مجرم نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا، بھاگا بھاگا باغ میں پہنچا اور گرمیوں میں بیٹھنے کے چھوٹے سے بنگلے کے چوبی فرش کے نیچے پناہ لی۔

ٹام نے سمجھ لیا کہ اب اس کا قصہ ختم ہوا۔ واحد امید جو باقی تھی بس یہی تھی کہ باپ عتاب سے اس کی شفاعت کرےگا۔

باپ کے متعلق ٹام کو صرف اتنا ہی یاد تھا کہ مونچھیں کالی کالی ہیں اور گرم سی ہتھیلی اتنی بڑی ہے کہ وہ اس میں اپنا چہرہ چھپا سکتا ہے۔ ماں کے متعلق تو اسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

وہ بیٹھا ٹھنڈی سانسیں بھر بھر کے تصور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عتاب کو اس کے کٹھرے سے باہر نکالا جائےگا تو کیا ہوگا۔

ٹام کے خیال میں دیو کے لئے کٹھرا بہر حال ضروری تھا۔ اس نے ایک کونے سے اپنی کمان اور تیر جو اس نے خود ہی بنائے تھے، اٹھائے لیکن اچانک اسے اس قسم کے ہتھیار کے موثر ثابت ہونے پر شک پیدا ہو گیا۔ وہ رینگتا ہوا اپنی پناہ‌گاہ سے نکلا اور چپکے سے چبوترے کو پار کر کے اپنے پھوپھا کارل کے مطالعے کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں دیوار پر پستول بھی تھے اور بندوقیں بھی۔

ٹام بخوبی جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پستول یا بندوق بھری ہوئی نہیں ہے ــ یہ بات وہ بار بار سن چکا تھا لیکن اسے امید تھی کہ مالی کے بیٹے کے پاس سے تھوڑی سی بارود پار کر دےگا۔ کوئی ننھا سا پتھر گولی کا کام دے سکتا تھا۔ وہ صوفے کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا اور تانبے کے دستے والا بڑا سا پستول اتار رہا تھا کہ اتنے میں کارل اندر داخل ہوا۔ اس نے حیرت سے سیٹی بجائی اور اپنی

سخت انگلیوں سے لڑکے کے کالر کا پچھلا حصہ پکڑ لیا۔ ٹام نے جھٹکے کے ساتھ خود کو پھوپھا کارل کی گرفت سے آزاد تو کرا لیا لیکن صوفے سے نیچے گر پڑا اور گھٹنا فرش سے ٹکرا گیا۔

وہ ڈگمگاتا ہوا کھڑا ہوا اور سر جھکا کے اداسی سے اپنی نظریں پھوپھا کے بڑے بڑے جوتوں پر جما دیں۔

"اچھا ٹام، ذرا مجھے یہ بتاؤ" کارل نے کہنا شروع کیا، "کیا تمہیں، ھیرالڈ بیرینگ کے بیٹے کو اس کمرے میں جس نے آج تک کبھی کوئی شرمناک بات نہیں دیکھی، چوری چھپے اور وہ بھی ارتکاب جرم کے ارادے سے داخل ہونا زیب دیتا ھے؟ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں سوچا بھی ھے؟"

"جی ھاں، سوچا ھے" ٹام نے جواب دیا۔ "پھوپھا جان، دراصل مجھے پستول کی ضرورت تھی۔ میں مقابلے کے بغیر ھار ماننا نہیں چاھتا۔ آپ کا عتاب جو والد صاحب کے ساتھ آ رہا ھے، میری لاش ھی پر قابض ہو سکتا ھے۔ جب تک دم میں دم ھے، میں اس سے ھار نہ مانوں‌گا۔"

کارل چند لمحے خاموش رہا پھر حلق سے دبے دبے خراٹے کی سی آواز نکالی اور کھڑکی کے پاس جا کے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ اس کام سے فرصت پاکے وہ مڑا تو ٹام نے اس کے چہرے پر وھی تاثر دیکھا جو اس سے قبل مونک کے چہرے پر دیکھ چکا تھا۔

"میں تمہیں کمرے میں بند کئے جا رہا ہوں، ناشتے سے بھی محروم رہوگے" پھوپھا کارل نے کمرے کے دروازے پر ٹھہرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ "جہاں ہو وھیں کھڑے رہو اور میں دروازہ بند کروں تو قفل کی کٹ کٹ کی آواز سنو۔ بس اسی طرح عتاب بھی اپنے دانت کٹکٹاتا ھے۔ اور کان کھول کے سن لو، کسی چیز کو چھونے کی ھمت بھی نہ کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ باھر نکلا، قفل میں کنجی گھمائی جس سے دو بار کٹ کٹ کی آواز ابھری۔ پھر اس نے کنجی نکال کے جیب میں رکھ لی۔

ٹام نے فوراً ھی کنجی کے سوراخ سے باھر جھانکا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا پھوپھا کونے پر پہنچ کر مڑ گیا ھے، کھڑکی کھول کے رینگتا ہوا ایک سائبان کی چھت پر پہنچا جہاں سے نیچے کیاری میں کود کر زنیا کے کئی پودوں کو زمین پر لٹا دیا۔ وہ اس شخص کی طرح جس کی تباھی یقینی ہو، جان پر کھیل جانے کو تیار تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جنگل کو بھاگ جائے، چھپنے کے لئے کوئی بھٹ کھود لے اور بیریاں اور پھول کھا کھا کے اس وقت تک کام چلائے جب تک اسے سونے اور اسلحہ کے کسی دفینے کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیابی نہ حاصل ہو جائے۔

وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا جنگلے کے کنارے کنارے دبکتا چھپتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں اسے سڑک پر ایک کار پھوپھا کارل کے گھر کی طرف آتی

دکھائی دی۔ سیاہ بالوں والے بڑی عمر کے آدمی کے پہلو میں سنہرے بالوں والی کوئی جوان عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کار کے پیچھے ہی پیچھے ایک دوسری کار بھی چھوٹے بڑے صندوقوں سے لدی پھندی چلی آ رہی تھی۔

ٹام ریلنگوں کے عقب سے بس اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ کاریں گیٹ کے اندر داخل ہوئیں اور ان کے انجن خاموش ہو گئے۔

اس بڑی سی ہتھیلی کی جس میں وہ اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا، دھندلی دھندلی سی یاد نے لڑکے کو پل بھر کے لئے ٹھہر جانے اور پھر سر پر پاؤں رکھ کر گھر کی طرف دوڑنے پر مجبور کر دیا۔ "کیا وہ واقعی میرے والد ہی ہیں؟" اس نے سیدھے پھولوں کی کیاریوں پر سے دوڑتے اور اس بات کو فراموش کرتے ہوئے سوچا کہ وہ تو تسلی اور رحم و کرم کی تلاش میں مطالعے کے مقفل کمرے سے نکل بھاگا تھا۔

ٹام عقبی دروازے سے داخل ہو کر سارے کمروں سے گزرتا ہوا سامنے والے کشادہ کمرے میں پہنچا اور دوسرے ہی لمحے اس کے تمام شکوک کافور ہو گئے۔ کارنیلیا، کارل، مونک، خادمہ اور نوکر سبھی نے سیاہ مونچھوں والے طویل قامت آدمی اور اس کے ساتھ آنے والی خاتون کو مرکز توجہ بنا رکھا تھا۔

"جی ہاں" بیرینگ کہہ رہا تھا، "میں اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بےتابی میں ایک روز پہلے ہی روانہ ہو گیا۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"میں ابھی بلائے لاتا ہوں" کارل نے کہا۔

"میں خود ہی آ گیا ہوں" ٹام نے کارنیلیا اور فربہ اندام خادمہ کے درمیان سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

بیرینگ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس کے خراشوں‌دار رخسار کو چوم لیا۔

پھوپھا کارل نے آنکھیں نکالیں۔

"لیکن تمہیں تو سزا دی گئی تھی! تمہیں تو کمرے میں بند کر دیا گیا تھا!"

"آج تو عام معافی کے تحت ٹام کا قصور بھی معاف" بیرینگ نے لڑکے کو جوان عورت کے پاس لے جاتے ہوئے کہا۔

«کیا عتاب یہی ہے؟» ٹام نے حیرت کے ساتھ سوچا۔ «شاید ہی ہو۔ عتاب جیسی تو لگتی نہیں۔»

"بیٹے، اب یہ تمہاری ماں ہوں‌گی" بیرینگ نے کہا۔ "اس ننھے احمق کی ماں بن جاؤ، کیٹ۔"

"ہم دونوں طرح طرح کے کھیل کھیلیں‌گے"۔ ایک گرم آواز نے اس کے کان سے اتنا قریب ہو کے کہا کہ اس میں گدگدی ہونے لگی۔

اس نے باپ کی بات پر یقین کرتے ہوئے عورت کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر

اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جو اسے کارل اور کارنیلیا کی یاد دلاتی۔ اب وہ ناشتہ ملنے کی طرف سے مطمئن ہو سکتا تھا۔

اتنے میں ٹام کو پکڑ کر نہلانے دھلانے کے لئے لے جایا گیا لیکن اس کی بےچینی ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ کارل اور کارنیلیا کی رگ رگ سے واقف تھا۔ دونوں جو کچھ کہتے تھے، کر بھی گزرتے تھے۔ ان کا اس وقت عتاب سے مل کر کوئی نہ کوئی سازش کرنا یقینی تھا۔ آخرکار ٹام نے خادمہ کی عدم موجودگی — وہ تولیا بدلنے گئی ہوئی تھی — سے فائدہ اٹھایا اور اس کمرے کی طرف دوڑ پڑا جسے وہ جانتا تھا کہ اس کے باپ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

اسے معلوم تھا کہ عتاب وہیں ہے، مقفل صندوق کے اندر مزے سے تاک میں بیٹھا، باہر نکالے جانے کا منتظر ہے۔

ٹام نے دروازے کے کنجی کے سوراخ سے آنکھ لگائی لیکن کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ سارا فرش لپٹے ہوئے قالینوں، سموروں اور چٹائی میں لپٹے لپٹائے سامان کے بنڈلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کئی صندوق جن میں سے دو کے ڈھکن کھلے ہوئے تھے، کشادہ کمرے کو جسے تغیر سے نا آشنا پرسکون زندگی کے سارے پھیکے پن کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا، غیرمعمولی ہیئت عطا کر رہے تھے۔

ٹام اپنے مقصد کی تکمیل سے ڈر تو رہا تھا لیکن دل پر سے بھاری بوجھ کو اتار پھینکنے کی خواہش نے اسے بری طرح بےچین کر رکھا تھا۔ بہرحال وہ دروازے کو کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ پلنگ پر پڑے ہوئے اصلی پستول کو دیکھ کے اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ اسے زندگی میں کبھی ان ھتھیاروں سے سابقہ نہیں پڑا تھا، محض کتابوں کے مطالعے سے جانتا تھا کہ کیا دبانے سے گولی چلتی ہے۔ اس نے براؤننگ کو پلنگ پر سے اٹھایا اور اسے اپنے آگے کی طرف پھیلے ہوئے ھاتھوں میں تھامے ہوئے ھمت کر کے کھلے صندوق کے قریب پہنچا۔

اور تب اس نے عتاب کو دیکھا۔

تقریباً تین فیٹ اونچا، چار سروں والا یہ دیو اسے صندوق کے اندر سے اپنی ٹیڑھی ترچھی ڈراؤنی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

ٹام نے زور سے چیختے ہوئے جو کچھ دبانا تھا اسے دبا دیا۔

ایسا لگا جیسے صندوق دھماکے سے پھٹ گیا ہو۔ اس سے چینی کے ٹکڑے اڑ اڑ کر کھڑکی اور میزوں سے جا ٹکرائے۔

ٹام پستول کو جس سے اب بھی گولیاں چل رہی تھیں، مضبوطی سے تھامے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اسے الگ پھینک دیا اور سسکیاں بھرتا ہوا بیرینگ کی بانھوں میں گر پڑا جس کا چہرہ فق ہو گیا تھا اور جو کارل اور کارنیلیا کے ساتھ دوڑا دوڑا اسی وقت کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"میں نے آپ کے عتاب کو مار ڈالا!" وہ خوشی اور صدمے سے چلایا۔ "میں نے

اسے گولی مار دی! اب وہ کسی کو چھو بھی نہیں سکتا! میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا! پردے میں ایک سوراخ کر دیا تھا اور کیڈ کے ساتھ رم پی تھی لیکن میں نہیں چاہتا کہ عتاب مجھ پر ٹوٹ پڑے!"

"کوئی بات نہیں، ٹام" بیرینگ نے اطمینان کی سانس لے کر بیٹے کے کپکپاتے ہوئے جسم کو سینے سے لگا کے کہا۔ "مجھے سارا قصہ معلوم ہو چکا ہے، میرے پیارے ٹام، میرے عزیز بیٹے!"

۱۹۲۸ء

بندرگاہ کا کمانڈنٹ

۱

اندھیرا ہو چکا تھا تب کمانڈنٹ مال‌بردار جہاز "ریکارڈ" کی تیز روشنی سے جگمگاتی ہوئی سیڑھی پر چڑھا۔ سیدھی قامت اور دبلے پتلے جسم کے اس بہتر سالہ بوڑھے کو بندرگاہ پر بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کا چھوٹا سا چہرہ جس کی داڑھی بڑی احتیاط اور توجہ سے بنائی گئی تھی، اپنی بےشمار جھریوں کی بنا پر سوکھی ناشپاتی کی یاد دلا رہا تھا۔ سفید گل مچھے کسی مچھلی کے پروں کی طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے اور سفید بھوؤں کے چھجوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی نیلگوں آنکھیں خوشگوار مسکراہٹ سے چمک رہی تھیں۔ تیز برقی روشنی میں اس کے ملاحوں‌والے کھردرے بھورے اوورکوٹ، سفید پتلون، نیلی ٹائی اور سستی چھڑی کی کچھ ایسی خستہ حالی نمایاں ہو رہی تھی کہ اسے لاکھ جتن کر کے بھی ان چیزوں سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمانڈنٹ کے زرد لانگ بوٹ جانے کتنی ہی بار پھٹ کے الگ ہو گئے تھے اور انہیں جانے کتنی ہی بار دھاگوں سے سل کے پھر سے جوڑا یا تار کے ٹکڑوں سے پائیدار بنایا گیا تھا۔ رنگین ریشم کا مضبوطی سے سلا ہوا ایک ٹکڑا اس کے اوورکوٹ کی سینے کی جیب سے جھانک رہا تھا۔

بوڑھے نے ذرا متفکر انداز سے اپنا کالر چھوا، پتلون کو روکے رکھنےوالے تسموں کی نافرمانی پر قابو پانے کے لئے اپنے شانے کسمسائے اور پھر پہرے کے افسر کے سامنے ٹھہر کے سر کو ایک جانب کچھ خم کیا اور بازو بھونڈےپن سے پھیلا دئے۔

"ارے ٹام لاسٹن!" کمانڈنٹ شوخ، کپکپاتی ہوئی آواز سے پکار اٹھا۔ "مجھے تو یقین تھا کہ اس شاندار جہاز پر آپ کو ایک بار پھر دیکھوں‌گا، اپنی پیاری بیٹسی کی یاد میں کھوئے ہوئے جو کہ وہاں رہ گئی ہے... بہت دور۔ گرج اور بجلی! سفر بخیر و خوبی جاری ہے نا؟"

"کٹگے!" لاسٹن نے کسی کو زور سے پکارا۔ "کمانڈنٹ آ گئے۔ اب کیا ہو؟"

"اٹھا کے نیچے پھینک دو!" سخت جواب سنائی دیا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں خوشامد، بدحواسی اور خوف کی جھلک نمودار ہو گئی۔

اس کی چھڑی یوں اٹھی اور نیچے آئی جیسے کتا اپنے مالک کے موڈ کا اندازہ لگانے کی کوشش میں دم ہلا رہا ہو۔

"ارے ان پر اتنی سختی بھلا کاھے کے لئے؟" لاسٹن نے نیک‌دلی سے بوڑھے کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اس تھپتھپاھٹ کے زور سے بوڑھا یوں بیٹھ گیا جیسے کوئی تہہ ہو جانےوالی چیز ہو۔ "میں سمجھتا ہوں کٹگے کہ تم ان سے ملنا چاھوگے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں، کمانڈنٹ، کٹگے تو محض مذاق کر رہے ہیں۔"

"مذاق کون کر رہا ھے؟" کشادہ شانوں‌والے دبلے پتلے کٹگے نے جو بھٹی جھونکنےوالوں کا سربراہ تھا، ان دونوں کے قریب آتے ہوئے کہا۔ "ہر بار گرٹون میں آمد پر کمانڈنٹ کا آ دھمکنا یقینی ہوتا ھے۔ اب تو جی اوبنے لگا ھے۔ ارے بڑے میاں، آپ کے تو سونے کا وقت ہو رہا ھے۔"

"میں ابھی ابھی "ابراھم ریپ" سے آ رہا ہوں" بوڑھا بھٹی جھونکنےوالے کے ناخوشگوار الفاظ کو نہ سننے کی کوشش میں بڑ ھانکنے لگا۔ "وھاں سب ٹھیک ٹھاک ھے۔ ان لوگوں کا سفر بہت اچھا رہا اور "ریپ" کل صبح ھی صبح یہاں سے چل دےگا۔ میں نے وھاں کافی پی اور بڑے ملاح ٹولبی کے ساتھ شطرنج کھیلی۔ بڑا شاندار آدمی ھے! اور کٹگے، آپ کا مزاج کیسا ھے؟ یقیناً سب کچھ ٹھیک ھی ھے نا؟ اور آپ کا معزز خاندان؟"

"لیجئے، سگریٹ پیجئے" کٹگے نے کہا اور بوڑھے کو ایک سیاہ سگریٹ تھما دی۔ "ذرا کس کے پکڑیئےگا ورنہ گرا دیں‌گے۔"

"اوہ، کپتان صاحب آ رہے ھیں!" بوڑھا جلدی جلدی اپنے کوٹ کو درست کرتے ہوئے چلایا اور دوڑ کے کپتان کے پاس پہنچ گیا جو اپنی بیوی کے ساتھ تھیٹر جا رہا تھا۔ "شام بخیر، کپتان صاحب! اور شام بخیر محترمہ... ھوں... شام اتنی خوبصورت ھے کہ سیرگاہ میں ٹہلنے اور شاندار موسیقی سے محظوظ ہونے کو جی تڑپ اٹھتا ھے۔ اچھا، آپ کا مزاج کیسا ھے؟ یقیناً سب کچھ ٹھیک ھی ھے نا؟ سفر میں کسی طوفان سے تو سابقہ نہیں پڑا؟ آپ کی صحت... شاندار ھے نا؟"

"ارے، یہ آپ ھیں، ٹیلس" کپتان ھنری ھالٹن نے اچانک ٹھہرتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی پینتیس سال کا تھا، طویل قامت اور بڑے سے چہرے پر موسمی اثرات کی چھاپ۔ "تو آپ اب بھی اپنی جگہ پر ڈٹے ہوئے ھیں۔ بہت خوب! مجھے آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تاھم اس وقت ھم لوگ ذرا عجلت میں ھیں اس لئے یہ ڈالر قبول کیجئے اور باورچی خانے میں بٹلر کے پاس جا کر ذرا دیر گپیں لڑائیے۔ آپ کی خوش قسمتی کا متمنی ہوں۔ میری، یہ کمانڈنٹ ھیں۔"

"اچھا تو آپ ھی کمانڈنٹ ھیں؟" نوجوان عورت مسکرائی۔ "بندرگاہ کے کمانڈنٹ؟ میں آپ کے متعلق سن چکی ہوں۔"

"مجھے تو سبھی جانتے ھیں!" ٹیلس ایک ھاتھ میں سگریٹ اور دوسرے میں

ڈالر اور چھڑی پکڑتے ہوئے بوڑھوں کے انداز میں زور سے ھنس پڑا۔ "ملاح بڑے جیالے ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہم باہمی طور پر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ملاحوں پر جان چھڑکتا ہو۔ میرا دل جہاز کے عرشے کی طرف اس طرح کھنچتا ہے... جیسے کہ... جیسے کہ... جیسے..."

باقی کو سننے سے کپتان کو دلچسپی نہ تھی اس لئے بیوی کو لے کے ساحل پر چلا گیا۔ ٹیلس نے ان کے پیچھے احتراماً اپنی ٹوپی سر سے اوپر اٹھائی اور پھر لاسٹن کی طرف مڑا:

"آپ کے کپتان کا کوئی جواب نہیں! عجیب شاندار آدمی ہیں، سر سے پاؤں تک شاندار۔"

یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہو رہا ہے کہ کمانڈنٹ (لوگوں نے اس کو یہی لقب دے رکھا تھا) کو بندرگاہ پر تقریباً ہر جگہ، بدنام‌ترین سرائے سے لے کر کسٹم دفتر تک لوگ بخوبی جانتے تھے۔ اس نے ساری زندگی ایک بڑی نجی فرم کے گودام میں کلرکی کی تھی اور آخر میں اسے ان اسباب کی بنا پر برطرف کر دیا گیا تھا جن کا تعلق اس کی قابل احترام عمر سے تھا۔ اس کے بعد سے اس کی بےاولاد بیوہ بہن، پچاس سالہ ربیکا بارٹیلس جس کے ساتھ وہ رہتا تھا، اس کی کفالت کر رہی تھی۔

مرگی ٹیلس کے ملاح بننے کی راہ میں حائل ہو گئی تھی اور یوں تو سن‌رسیدگی کے ساتھ ساتھ مرگی کے دوروں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا لیکن پھر وہ صرف اپنے تخیل ہی میں ملاح بن سکا۔ صبح کو اس کی بہن اس کے کوٹ کی جیب میں بڑی سی سینڈوچ ٹھونستی، متفرق مصارف کے لئے کچھ پیسے دیتی اور کمانڈنٹ اپنی چھڑی کو لہراتا ہوا بندرگاہ کی گشت پر نکل کھڑا ہوتا۔ اس کی ان سرگرمیوں کے پیچھے پیسوں کے لالچ کا ذرا بھی ہاتھ نہیں ہوتا تھا۔ دراصل جہازوں اور ملاحوں میں اسے بچپن ہی سے کشش محسوس ہونے لگی تھی، وہ ابھی ماں کی گود میں تھا جب اس نے سمندر کی نیلگوں دیوار سے اترتے ہوئے بادبانوں کی سمت اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلا دئے تھے۔

لرزتے ہوئے سوکھے سکھٹے ہاتھوں سے سگریٹ جلانے کے بعد کمانڈنٹ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا باورچی‌خانے کی طرف چل دیا جہاں باورچی نے اس کی بھوؤں اور گل مچھوں پر نظر پڑتے ہی زوردار قہقہہ بلند کیا۔

"ارے مجھے تو یقین تھا ٹیلس کہ آپ آئیں‌گے ضرور" آخرکار اس نے بوڑھے کی طرف اسٹول بڑھاتے ہوئے کہا اور اس کے لئے کیتلی سے ایک مگ بھر کے کافی انڈیلی۔ "آخر آپ غائب کہاں تھے؟ "اسٹیلا" پر تو آپ جا نہ سکے ہوں‌گے۔ تیل اتارنے کے اڈے سے کچھ آگے فیکٹری کے بالکل سامنے لنگر انداز ہے۔ اس وقت لوگ وہاں پینے اور تاش کھیلنے میں مصروف ہیں۔"

"اتنی تیزی سے نہیں۔ ایسی بھی عجلت کیا، میرے محترم پیٹر بٹلر" ٹیلس نے

جواب دیا، اسٹول کو میز کے پاس کھسکا کے اس پر بیٹھ گیا اور دونوں ھاتھ اپنی چھڑی کے خم پر رکھ لئے۔ "آپ کی لائق توقیر صحت کیسی ھے؟ سفر اچھا رھا نا؟ آپ کی محترمہ بیگم صاحبہ تو یقیناً بڑے صبر و سکون سے آپ کی واپسی کا انتظار کر رھی ھوں گی نا؟ ھاں تو... میں "اسٹیلا" پر جا چکا ھوں۔ ان لوگوں نے اس وقت تک تاش کھیلنا شروع نہیں کیا تھا لیکن اسی وقت تاش کی گڈی خرید لانے کے لئے مال افسر کو بھیجا تھا۔ جی ھاں۔ لیکن میں وھاں سے جلد ھی چلا آیا تھا کیونکہ وھاں دو افراد ایسے ھیں جن کا میرے ساتھ طرز عمل... جی ھاں... دوستانہ نہیں ھوتا۔ تو انہوں نے کہا کہ میں آوارہ بوڑھا ھوں، لوگوں کے پیچھے پڑ جاتا ھوں اور یہ کہ... ظاھر ھے کہ میں یہ سب سن کے پریشان ھو گیا اور ان لوگوں کو نہ بتا سکتا کہ کیسی شدید محبت کرتا ھوں... جیالے ملاحوں سے... عرشے سے، ھر شے سے... لیکن میرے دل میں یہ محبت همیشہ ھی رھی ھے اور آپ جانتے ھیں..." ٹیلس نے اداس ھو کے سسکی بھری۔ بٹلر نے الماری سے انناس کی شراب کی چھوٹی سی بوتل نکالی اور اسے زور سے میز پر رکھ دیا۔

"بات دراصل یہ ھے کہ آپ جیسے بوڑھے ملاح کو پورا گلاس چڑھا جانا چاھئے" بٹلر نے کہا۔ "ٹھیک ھے نا؟ آئیے پئیں اور ان بدمعاشوں کو بھول جائیں۔ آپ کی صحت کے لئے! میری صحت کے لئے! ایلو! ھپ!"

بٹلر نے نصف پیالی شراب حلق میں انڈیل کے اپنے نچلے ھونٹ کو انگوٹھے سے پونچھا اور بڑے غور سے ٹیلس کو دیکھنے لگا جس نے دھیرے دھیرے گلاس کو خالی کر دینے کے بعد ھونٹوں کو یوں جنبش دی جیسے "خوب" کہنا چاھتا ھو۔ پھر ٹیلس آنکھوں کے پانی کو پونچھنے اور ناک چھنکنے کے بعد بجھی ھوئی سگریٹ کے کش لینے لگا۔

"دوسری دے دوں؟"

"جی نہیں، شکریہ۔ ممکن ھے بعد میں لے لوں۔ گرج اور بجلی! "اسٹیلا" اچھا جہاز ھے، بہت ھی اچھا" ٹیلس نے کہا اور ھر لفظ کے ساتھ اس کے سر میں خفیف جنبش پیدا ھوئی۔ "اسے ۱۹۰۱ء میں سمندر میں اتارا گیا تھا۔ چارلی اب «سائرن» پر کام نہیں کر رھا ھے، کل اس سے مارلی کے ھوٹل میں میری ملاقات ھوئی تھی۔ «میں آرام کر رھا ھوں» وہ کہتا ھے۔ «اصل بات یہ ھے» چارلی کہتا ھے، «مجھے اس فرم سے ایک معاملے میں نپٹنا ھے، ان لوگوں نے میری پوری اجرت نہیں ادا کی»۔ آج میں «بلیک ھل» گیا تھا، بس یوں ھی حال چال معلوم کرنے کے لئے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ھی ھے۔ رمپر نے اپنا شراب خانہ دوسرے نکڑ پر منتقل کر دیا کیونکہ وہ عمارت فروخت ھو گئی۔ اس میں اب اسٹور قائم ھوگا۔ واٹسن کو کسی طرح پنشن ھی نہیں مل رھی ھے، کیسی عجیب بات ھے! وہ پیتا ھے، مجھ پر بجلی گر پڑے، وہ عجب شان سے پیتا ھے بالکل کسی اونٹ یا سمندری سانپ کی طرح۔ اس کی بادہ نوشی کو دیکھنے

تو دیکھتے ہی رہ جائیے۔ وہ مگ اٹھائے گا اور اسے دیکھنے لگے گا۔ «فلپائن میں» واٹسن کہتا ہے، «ہاں»، وہ کہتا ہے، «کچھ ایسی ویسی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ جمیکا»، وہ کہتا ہے، «بہت اچھی جگہ ہے۔ "رائل اسٹار" ڈوب گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ طوفان میں پھنس گیا تھا۔ گولیوں کی بوچھار! آپ سائمن لیکری سے واقف تھے؟ ارے اسی قزاق سے؟ جی ہاں، سائمن لیکری بحری قزاق تھا اور اس نے ایک بار میری تواضع کی تھی اپنی ایک... مہم کے بعد»۔ اس نے یہ کہا تھا: «وہ لوگ "نوچ" کو کبھی بھی غرقاب نہ کر سکتے» وہ کہتا ہے، «اگر خود شیطان نے ان کی مدد نہ کی ہوتی۔» پھر وہ گالیاں بکنے لگا۔ اور ہر شخص متفکر ہو گیا۔ ویسے یہ لیکری تھا بہت ہی اچھا آدمی، میں اسے سراہے بغیر نہیں رہ سکتا! گرج اور بجلی! تب میں نے اس سے کہا: «لیکری، ایک بات سنو، تم مجھے اپنے جہاز پر رکھ لو۔ تختے جڑنے کے لئے! ہپ، ہپ، ہرا! زندگی اور موت کے لئے! لیکن وہ مصروف تھا اور اس نے میری بات نہ سنی۔ اس صورت میں "نوچ" کی تباہی کی نوبت نہ آتی۔ میں کہیں موجود ہوں تو شیطان بھی..."

"بےشک، کمانڈنٹ" لاسٹن نے باورچی خانے کے دروازے پر نمودار ہوتے ہوئے کہا، "آپ نے ان لوگوں کی اصلاح کر دی ہوتی۔"

"ظاہر ہے" ٹیلس نے تصدیق کی۔ "واقعی بالکل یہی کیا ہوتا۔ ظاہر ہے۔"

ایک اور گلاس چڑھانے کے بعد ٹیلس کچھ اور جوش میں آ گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جلد ہی واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا اور اس نے لوگوں سے اپنی مختلف ملاقاتوں کے قصے یوں چھیڑ دئے کہ اپنی طویل زندگی میں جو کچھ دیکھا سنا تھا اس میں اپنے خیالات جوڑ جوڑ کر نمک مرچ بھی لگاتا جا رہا تھا۔ وہ ابھی نشے میں دھت نہیں ہوا تھا، صرف زور زور سے قینچی کی طرح زبان ہی چلا رہا تھا، خود کو اس طاقتور نوجوان جیسا تصور کر رہا تھا جو دھرتی کے سرے تک بحری سفر کرنے کو تیار ہو۔ تاہم وہ دو بار باورچی کو سینور ربیرا کہہ کے مخاطب کر چکا تھا جو دراصل جہاز «گرینل» کے چیف مکینک کا نام تھا۔ اسی طرح اسے لاسٹن پر دو مستولی جہاز «بولویا» کے بڑے ملاح کا دھوکا ہوا تھا اور اسے ہر باؤمین کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ آخرکار باورچی نے کمانڈنٹ سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا صرف ایک ہی طریقہ تھا لیکن اس طرح کمانڈنٹ کا کسی احتجاج کے بغیر اٹھ کے چل دینا یقینی تھا۔ لاسٹن نے باورچی کو آنکھ مارتے ہوئے کہا:

"ارے کمانڈنٹ، ہمارے جہاز کو "پلگرم" سے باندھنے میں ذرا ہمارے جوانوں کی مدد تو کر دیجئے۔ ہم لوگ بندرگاہ پر جہاز کو باندھنے کی جگہ تبدیل کرنے جا رہے ہیں۔"

ٹیلس نے پیچھے سمٹ کر اپنی بھوؤں کے نیچے سے دھیرے دھیرے لاسٹن کی طرف نظر اٹھائی پھر اس نے بےچینی کے ساتھ اپنے کالر کو کھڑا کر لیا۔

"«پلگرم» سے میں واقف ہوں" ٹیلس نے کہنا شروع کیا لیکن رقت انگیز آواز سے، "یہ بہت اچھا جہاز ہے۔ ۱۹۱۴ء میں کیپ ہنگر کے نزدیک پتھریلے ساحلی علاقے میں اس میں دو سوراخ ہو گئے تھے... رفتار بارہ بحری میل... ظاہر ہے۔"

"جائیے نا، ٹیلس، ہمارے جوانوں کی ذرا مدد کر دیجئے نا" باورچی نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔

کمانڈنٹ نے دھیرے دھیرے اپنی ٹوپی کے چھجے کو نیچے کی طرف کھسکایا اور اسٹول سے بہ دقت اٹھ کھڑا ہوا۔ وزنی کیبلوں کی موٹائی کے نہایت ہی واضح تصور نے بوڑھے کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ اسے سردی اور تھکن محسوس ہونے لگی۔

"میرے لئے گھر لوٹ جانا بہتر ہوگا" ٹیلس نے تیزی سے بٹلر اور لاسٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنے بازوؤں کو سینوں پر موڑے، آنکھیں نصف بند کئے اپنی اہمیت کے احساس کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ "جی ہاں، مجھے جانا ہی ہوگا کیونکہ میں نے وعدہ کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بس آٹھ ہی بجے تک باہر رہوں گا۔ اچھا تو جوانو۔ آپ لوگ جہاز کو «پلگرم» سے باندھئے۔ ہا۔ ہا! تفریح کیجئے۔ میں چل دیا..."

"کیسا بیڈھب معاملہ آن پڑا" بٹلر نے کہا۔ "آپ چل دئے! ارے کمانڈنٹ، ہمارے بڑے ملاح اور ہمارے جوان سب لوگ بس لوٹنے ہی کو ہیں۔ چلئے، ہماری کچھ مدد کر دیجئے نا۔"

"نہیں، نہیں۔ مجھے جانا ہے" ٹیلس نے جلدی جلدی کہا، "کیونکہ دیکھئے نا، میں نے جلد ہی واپسی کا وعدہ کیا تھا۔"

"اور اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟" نوجوان ملاح شینک نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کہئے، نوجوان! سفر اچھا رہا نا؟ اور ان کی صحت کیسی ہے، میرا مطلب آپ کی محترمہ..."

"والدہ — کہیں غلطی نہ کر بیٹھئے گا — ان کی صحت بہت عمدہ ہے۔ لیکن یہ تو غیر متعلق بات ہوئی۔ جی چاہے تو ذرا بحری کلب تک چلے جائیے۔ وہاں ایک لڑکی بوفے پر کام کرتی ہے، پیگی اسکاٹر۔"

"پیگی اسکاٹر؟" ٹیلس یوں چھکنے لگا جیسے اس میں نئی جان پڑ گئی ہو۔ اب تو اسے "ریکارڈ" کے موٹے موٹے کیبلوں سے بھی خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ "ہاں بھئی، میں اس لڑکی سے بخوبی واقف ہوں۔ کیا شاندار لڑکی ہے، قسم کھاتا ہوں، جھوٹ بول رہا ہوں تو میرے دل ہی پر گولی لگے! یقین مانئے، میں اسے جانتا ہوں۔"

"تو جا کے اس سے کہہ دیجئے کہ اس کا دوست ولیم برانٹ کوئی مہینہ بھر

پہلے اینو میں طاعون کا شکار ہو گیا۔ «کاکس کومب» تھوڑی ہی دیر قبل آیا ہے۔ اس کا ایک ملاح «ہیوریکا» میں تھا جہاں ہمارے ساتھی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تو اسی نے ہمیں یہ خبر سنائی۔ پیگی کو کون بتائےگا؟ کوئی بھی نہیں۔ سبھی ڈرتے ہیں۔ ایسی بری خبر اسے بتائی بھی کیسے جا سکتی ہے؟ بچاری رو پڑےگی۔ لیکن ٹیلس، آپ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ آپ ٹھہرے پختہ عزم کے مالک اور عمر میں بھی ریت گھڑی سے کم نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کون سی بات کیسے کی جانی چاہئے۔ کیا یہ سچ نہیں؟"

"سچ ہے" لاسٹن نے اپنے پیر کو ہٹاتے ہوئے فیصلہ‌کن لہجے میں کہا۔

"سچ ہے" بٹلر نے مختصر خاموشی کے بعد اتفاق‌رائے کیا۔

"بس یہ خیال رہے کہ فوراً ہی صاف صاف کہہ دیجئےگا۔ بات کو گھما پھرا کر بچاری کو اذیت میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوف سے کتے کی طرح دم نہ دبا لیجئےگا" شینک نے ہدایت کی۔

"ہاں، اس طرح کی بات کو خواہ مخواہ طول دینا اور بھی زیادہ باعث تکلیف ہوتا ہے" بٹلر نے تصدیق کی۔ "جو کہنا ہے کہا اور چل دئے۔"

بوڑھے نے ہونٹوں کو سکوڑ کے سر جھکا لیا۔ اب صرف ملاحوں کی کام کے وقت کی جیسی باقاعدہ اور گہری گہری سانسوں کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

"معاملے کا خاص پہلو یہ ہے کہ آپ کے منہ سے" شینک نے پھر کہنا شروع کیا، "یہ بات کسی درخت کی سرگوشی یا کسی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی معلوم ہوگی: «برانٹ۔ اینو۔ میں۔ طاعون۔ سے۔ چل بسا۔» یوں کہنا آسان ہے۔ اگر میں جاؤں تو یہ آپ جانتے ہیں نا، کچھ نامناسب سا لگےگا۔ مجھے ایسے موقعے کے لئے نشے میں دھت ہونا پڑےگا۔"

"ہاں، فوراً اور صاف صاف" ٹیلس بھرائی ہوئی آواز سے چیخ اٹھا اور فرش پر پاؤں مارا۔ "دلیری اور ہمت کے ساتھ۔ اس کمبخت چھوکری کا دل کاہے کو ہے پتھر ہے پتھر۔ صحیح معنوں میں گھوڑے کا سم۔ میں شینک، آپ سے اور بٹلر، آپ سے اور لاسٹن، آپ سے وعدہ کر رہا ہوں۔ ابھی جا کے کہہ دوں‌گا۔"

۲

پیگی اسکاٹر کلب کے زیریں ہال میں جو پیش دالان کے دائیں جانب واقع تھا، چائے بوفے پر مصروف تھی۔ اس کا قد تو چھوٹا تھا لیکن گٹھے ہوئے جسم کے تمام اعضا متناسب تھے، چہرے پر انھوریاں اور ذرا چپٹی سی ناک۔ بھوری بھوری آنکھیں سنجیدہ اور متجسس سی لگتی تھیں اور کوئی درجن بھر پنوں کی مدد سے گدی پر

جوڑے میں بندھے ہوئے گھرے سرخ رنگ کے بال خوب پالش کئے ہوئے کانسے کی طرح چمک رہے تھے۔

اس کی معاون نے اس کی آستین کی جس کے کنارے کنارے لیس ٹنکی تھی، تراش کا دسویں بار جائزہ لینا شروع کیا ہی تھا کہ پیگی کی نظر ٹیلس پر پڑی۔ وہ بار بار جاننےوالے گاھکوں کے پاس ٹھہر ٹھہر کر تعظیماً سر خم کرتا، نیم دائرہ بناتا ہوا بوفے کی طرف آ رہا تھا۔

"ارے دیکھ، میلی، کمانڈنٹ آ دھمکا" پیگی نے مٹی کی ایک بڑی پلیٹ میں بسکٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "وہ یہیں آ رہا ہے۔ اچھا، اچھا چلو آگے بڑھو، بوڑھے بکی!"

ٹیلس نے کچھ فاصلے ہی سے پیگی کے سامنے سر جھکایا اور پھر سیدھا کاؤنٹر پر آ گیا۔ پیگی نے اس کی طرف دیکھا اور اپنی نگاھوں سے اس کی ضعیفی اور دن بھر کی بھاگ دوڑ کے متعلق دریافت کیا پھر وہ اس کے سنجیدہ طور پر پراسرار چھرے کی طرف متوجه ہو کے مسکرا دی۔

"کھو، میری قابل احترام لڑکی، میری سدا بھار..." ٹیلس نے کھنا شروع کیا پھر پلکیں جھپکانے لگا اور قدرے توقف سے نرم لھجے میں اپنی بات پوری کی: "یقیناً سفر بہت اچھا رہا ہوگا... اوہ، معاف کرنا، یہ نه کھنا چاھئے تھا۔ میں تو کھوں گا که شام بڑی خوبصورت ہے۔ کس حال میں ہو تم؟"

"ارے کمانڈنٹ، آپ کو یہ چاھئے؟" پیگی نے اس کی طرف ایک بسکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ولیم برانٹ کی صحت کے نام پر اسے کھائیے۔ آپ نے کچھ ہی روز پہلے اس کے متعلق پوچھا تھا۔ تو وہ جلد ہی واپس آنے والا ہے۔ دو ہفتے قبل جو خط ملا ہے اس میں اس نے یہی لکھا ہے۔ وہ جب آئےگا نا تو میں اس میز پر آپ کے لئے شاندار رم کی پوری صراحی رکھ دوں‌گی... چائے کے بغیر اور میں خود بھی آپ کے ساتھ بیٹھوں‌گی۔ لیکن اس وقت، اس وقت تو آپ اس جگه سے کھسک لیجئے کیونکه ویٹر اپنی ٹرے سنبھالے دوڑے دوڑے یہاں آئیں‌گے تو آپ کو بری طرح دھکے کھانے پڑیں‌گے۔"

"شکریه" ٹیلس نے بسکٹ کو جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "ہاں... جب برانٹ واپس آئےگا۔ پیگی، پیگی!" وہ اچانک چیخ سا اٹھا۔

لیکن اس نے اور کچھ بھی نه کہا، بس اس کے جھریوں‌دار گال تھرتھرا کر رہ گئے۔ اس کی آنکھیں نم اور پریشان سی نظر آ رہی تھیں۔

پیگی اچنبھے میں پڑ گئی کیونکه کمانڈنٹ نے خود کو اتنی بےتکلفی سے پیش آنے کی کبھی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے بوڑھے کی طرف غور سے دیکھا اور کچھ جھک بھی گئی۔

ٹیلس کو جو کھنا تھا کھنے کی ھمت نه پڑ سکی۔ وہ نہیں چاھتا تھا که خوبصورت پھولوں اور چینی کے خوبصورت برتنوں‌والے اس خوبصورت بوفے کے پیچھے

سے کوئی بھیانک نسوانی چیخ ابھر کر سارے ہال میں گونج اٹھی۔ اس نے بےچینی سے اپنی سانس کی ہوا کو نگل لیا کیونکہ وہ باہر نکل آتی تو اس نے پیگی کو اس کے برانٹ سے متعلق حقیقت کے حامل لفظوں کے وار سے زمین پر ڈھیر کر دیا ہوتا۔ اس نے تعظیماً سر کو خم کیا لیکن ڈگمگاھٹ سے گردش کرتے ہوئے کسی لٹو کی طرح آگے سے پیچھے کی طرف اور بزدلی کے ساتھ وھاں سے چل دیا۔

پیگی نے اس کے بعد آستین کی تراش پر میلی سے مزید گفتگو نہ کی۔ اس کے ذھن میں ٹیلس کے منہ سے "پیگی! پیگی!" سننے کے بعد کوئی عجیب و غریب کیفیت منڈلاتی رھی۔ وہ پورے گھنٹے بھر برانٹ کے بارے میں سوچتی رھی، بجھی ہوئی شمع کی طرح افسردہ ہو گئی اور آخر میں اس نے بار کی سنگ مرمر کی سطح پر زور سے مکا جما دیا۔

"میں بھی کیسی احمق ہوں کہ بوڑھے کو روک نہ لیا!" اس نے پچھتاتے ہوئے کہا۔ "اس نے تو کسی نہ کسی طرح مجھے بےچین کر دیا۔"

"ارے تم یہ بھی نہیں سمجھ پا رھی ہو کیا کہ کمانڈنٹ نشے میں تھا؟" میلی نے کہا۔ "بوڑھے کے منہ سے بھبکے نکل رہے تھے۔ میری ناک گواہ ہے۔"

پیگی ہشاش بشاش ہو گئی لیکن اسی لمحے سے اس کے خیالوں میں ایک سیاہ دھبا بس کے رہ گیا اور چند دنوں بعد ٹیلس کی بہن کے بھیجے ہوئے پرچے سے اسے یہ افسوس‌ناک خبر معلوم ہوئی تو اس دھبے نے ایسی کمانی کا کام دیا جس نے بھاری ضرب کو قدرے نرم کر دیا۔

"یہ رھا میں، میری بہن" ٹیلس نے بالآخر گھر پہنچ کے بڑھیا سے کہا جو کمرے کے ایک گوشے میں سلائی مشین کے آگے بیٹھی تھی۔ "تھکن سے بالکل نڈھال ہو رھا ہوں۔ ایسا لگتا ھے کہ سب کچھ ٹھیک ھی ھے، سب کی صحت اچھی ھے۔ میں «لا ٹراویئٹا»، «اسٹیلا»، «ابراھم ریپ» اور «ریکارڈ» پر ہو آیا۔ کپتان ہالٹن سے ملاقات کی۔ «ہیلو!» کپتان مجھ سے کہتے ہیں۔ «شاباش» وہ کہتے ہیں، «اچھے جوان ہو، ٹیلس۔ تم اب بھی کسی بادبان کو ہوا کے مقابل تھامے رہ سکتے ہو۔» انہوں نے مجھے تھیٹر چلنے کے لئے مدعو کیا۔ لیکن میں تو شورغل والی صحبتوں سے شرماتا ہوں۔ ہم نے تھوڑی تھوڑی سی پی۔ پھر انہوں نے مجھے ایک بسکٹ، ایک ڈالر دیا اور یہ... نہیں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ بسکٹ تو پیگی اسکاٹر نے دیا تھا۔ بچاری کے منگیتر کا انتقال ہو گیا۔ بڑا دشوار کام سپرد کیا گیا تھا لیکن میں نے اسے بہادری سے انجام دیا۔ تم تو تصور بھی نہ کر سکوگی کہ کیسے اس نے آنسو بہائے، کیسی چیخیں ماریں... میں وھاں سے چلا آیا۔"

"آپ نے پیگی کو کچھ بھی نہیں بتایا، بھائی جان" ربیکا نے جواب دیا۔ "آپ کو میں خوب جانتی ہوں۔ اب سو جائیے۔ بھوک لگی ہو تو الماری پر رکھے ہوئے بڑے والے پیالے سے کچھ کوفتے نکال لیجئے۔"

ایک سال گزر گیا۔ "ریکارڈ" پھر بندرگاہ پر آیا لیکن کمانڈنٹ اس جہاز پر نہ پہنچا۔ وہ غریب تو شوربا کھاتے وقت گلے میں پھندا پڑ جانے سے کھانسی کے دورے میں دوسری دنیا کو سدھار چکا تھا۔ ٹیلس اتنی دیر تک کھانستا اور ہانپتا رہا تھا کہ اس کے کمزور حلق میں خون کی ایک رگ پھٹ گئی۔ نقاہت نے اسے بستر سے لگا دیا اور دو دنوں کے بعد چل بسا۔

"کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے" شام کو لاسٹن نے بٹلر سے کہا۔ "اب ہمارے ہاں آ کے ادھر ادھر کی خبریں کون سنائے گا؟"

اس کے منھ سے یہ بات نکلی ہی تھی کہ لال لال چہرے کا ایک لمبا، برہنہ پا، بےحیا نوجوان جس کی وضع قطع سے وحشت برس رہی تھی، جلدی جلدی عرشے پر آیا اور پھر عملے کے رہائشی حصے میں داخل ہو گیا۔

"ہیلو!" وہ اپنی بےڈھنگی ہیٹ کو لہراتا ہوا زور سے چلایا۔ "سفر کیسا رہا، ملاحو؟ اچھا رہا نا؟ آپ کے خاندان کے لوگ اب بھی زندہ ہیں؟ اٹھئے، اٹھئے! شراب کے ایک گلاس سے میری تواضع کیجئے!"

"ویسے تم ہو کون؟" بٹلر نے پوچھا۔

"بندرگاہ کا کمانڈنٹ! ٹیلس مر گیا تو... میں نے اس کی جگہ لے لی۔"

لاسٹن تلخی سے مسکرایا، خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا، خاموشی سے اس نوجوان کی کہنی پکڑی اور گھسیٹتا ہوا ساحل کو جانےوالے راستے تک لایا۔

"یہاں سے تم بھاگ کھڑے ہو" اس نے کہا۔ "اور ہمیں دوبارہ اپنی صورت نہ دکھانا۔"

"عجیب بات ہے!" وہ لاسٹن کی پہنچ سے کافی دور ہٹ کر چلایا۔ "کوئی تمہارے لانگ بوٹ چرا لے تو کیا نئے نہ خریدوگے؟ میں تو تم لوگوں کے ساتھ اچھائی ہی کرنا چاہتا تھا۔ چورو، بدمعاشو، کمینو، تمہیں شارک مچھلیاں ہڑپ کر جائیں!"

"نہیں، نہیں" لاسٹن نے اس احمق کے رویے سے برا نہ مانتے ہوئے عرشے پر سے جواب دیا۔ "یہ تو کھلی ہوئی جعلسازی ہے۔ «سفر اچھا رہا نا؟» جس طرح پوچھا جانا چاہئے اس طرح تمہارے جبڑے کبھی بھی نہ پوچھ سکیں گے۔"

پڑھنے والوں سے

«رادوگا» اشاعت گھر اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے متعلق آپ کی قیمتی رائے اور آئندہ مطبوعات کے بارے میں آپ کی تجاویز اور مشوروں کا بصد شکریہ خیرمقدم کرے گا۔

براہ کرم اپنے تبصرے اور مشورے مندرجہ ذیل پتے پر بھیجئے:

«رادوگا» اشاعت گھر

مکان نمبر ۳۳، سی۔ ۱۴
تاشقند ـ ۷۰۰۰۱۱، جی۔ ایس۔ پی۔
سوویت یونین

Raduga Publishers
House No. 33, C-14
Tashkent—700011, GSP
USSR

